قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہترواں سال

دسمبر 2014ء

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

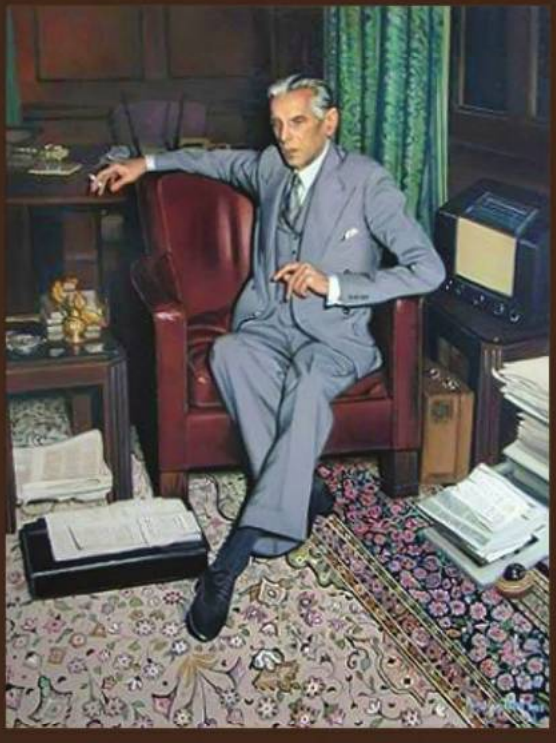

قائداعظم نے فرمایا:

''مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کے طرزِ حکومت کا تعین کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان کردیا تھا۔ الحمدللہ، قرآن مجید ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا''۔ (آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس سے خطاب

جلد 67 شمارہ نمبر 12 دسمبر 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قائداعظمؒ.....بحیثیت گورنر جنرل پاکستان	ادارہ	4
علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں	حافظ غلام مرشد مرحوم	7
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	16
پرویز صاحب کا نظریہ حدیث وسنّت	ملک منظور حسین لیل	25
ع ب د	لغات القرآن	33
جاوید چوہدری صاحب کی خدمت میں چند گذارشات	خواجہ ازہر عباس	38

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Naba* (النباء) – Durus-al-Qur'an **By G.A.Parwez**

Parah 30: Chapter 1 **Translated by: Dr. Mansoor Alam** 47

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

لمعات

قائداعظمؒ.....بحیثیت گورنر جنرل پاکستان

14 اگست 1947ء کے بعد قائداعظمؒ 'ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے "بے تاج بادشاہ" نہیں تھے۔ وہ اب مملکت پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ اپنی اس جدید پوزیشن میں بھی' بار بار انہی خیالات کو دُھراتے رہے جنہیں وہ گذشتہ دس سال سے مسلسل و متواتر پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم ان میں سے صرف چند ایک مقامات پر ارشاد فرمودہ الفاظ کو درج ذیل کرتے ہیں۔

انہوں نے 11 اکتوبر 1947ء کو' خالق دینا ہال' کراچی میں' حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ افسروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے' اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام' مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

پھر انہوں نے اُسی ماہ کی تیس تاریخ کو' یونیورسٹی سٹیڈیم' لاہور' میں ایک جمِ غفیر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> ہم (ہندوؤں کی طرف سے) ایک ایسی سازش کا شکار ہوئے ہیں جو بڑی گہری اور سوچ سمجھ کر اختیار کی گئی تھی۔ اور جسے دیانت' شجاعت اور عزت کے ابتدائی اصولوں تک کو بالائے طاق رکھ کر بروئے کار لایا گیا ہے۔ ہم بحضور رب العزت سجدہ ریز ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی ہمت اور یقینِ محکم عطا فرمایا جس سے ہم نے شر کی ان تمام قوتوں کا پورا پورا مقابلہ کیا۔ اگر ہم نے قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کی تو مَیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آخرالامر کامیابی ہماری ہی ہوگی۔
>
> میرا آپ سب سے' اور ان تمام افراد سے جن تک میرا یہ پیغام پہنچے مطالبہ یہ ہے کہ آپ پاکستان کو اسلام کا محکم قلعہ بنانے اور اپنے آپ کو ایک ایسی عظیم ملت کی شکل میں تعمیر کرنے کے لئے' جس کا مقصد ملک کے اندر اور باہر' امن قائم کرنا ہو'.....عندالضرورت سب کچھ قربان کر دینے کا عہد کریں۔

14 فروری 1948ء کو انہوں نے سبی دربار میں، اہل بلوچستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اس اسکیم کو پیش کرتے ہوئے جو اصول میرے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھا وہ مسلم ڈیما کریسی کا اصول تھا۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس ذات اقدس واعظم۔ حضور رسالت مآب ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں مضمر ہے جس نے ہمیں قانون (خداوندی) عطا فرمایا۔ آیئے۔ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اسلامی اصولوں پر رکھیں۔ ہمارے خدا نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہماری مملکت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔

19 فروری 1948ء کو انہوں نے آسٹریلیا کے باشندوں کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے فرمایا:۔

ہماری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں، حقوق، تکریم اور عزت نفس کے اعتبار سے سب مساوی ہیں۔ اس لئے ہمارے اندر باہمی وحدت کا ایک خاص احساس ہے لیکن آپ کو اس باب میں کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے کہ پاکستان میں کسی قسم کی تھیا کریسی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) کارفرما نہیں۔

پھر اسی مہینے میں انہوں نے اہل امریکہ کے نام ایک براڈ کاسٹ میں، پاکستان کے مجوزہ آئین کے بارے میں ایک پیغام نشر کیا جس میں انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا علمبردار جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے وارث ہیں اور آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ کچھ بھی ہو، پاکستان میں تھیا کریسی کسی صورت میں بھی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) ''خدائی مشن'' کو پورا کریں۔

انہوں نے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ میں ایک عظیم جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ سب اس باب میں مجھ سے متفق ہوں گے، ہم خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، آخر الامر مسلمان ہیں۔ لہٰذا اگر تم ایک ملت بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبہ جاتی تفریق کو خیر باد کہئے۔ صوبہ جاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندیاں..... شیعہ، سنی وغیرہ..... لعنت ہیں۔

انہوں نے 26 مارچ 1948ء کو، چٹاگانگ میں عام استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

آپ درحقیقت میرے اور میری طرح لاکھوں مسلمانوں کے دل کی ترجمانی کریں گے جب آپ کہیں گے کہ پاکستان کی

بنیاد عدلِ عمرانی اور اسلامی سوشلزم پر رکھنی چاہئے جو اخوتِ انسانی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ تم ایسا کہنے میں بھی میرے خیالات کی ترجمانی کرو گے کہ یہاں ہر فرد کو (نشوونما کے) یکساں مواقع میسر ہونے چاہئیں۔

17 اپریل 1948ء کو انہوں نے پشاور میں قبائلی جرگہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

آپ نے میرا جس گرم جوشی سے استقبال کیا ہے اور جن الفاظ میں میری خدمات کا تذکرہ کیا ہے مَیں اس کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں۔ مَیں نے جو کچھ بھی کیا ہے اسلام کا خادم ہونے کی حیثیت سے کیا ہے..... ہم مسلمان ایک خدا ایک کتاب قرآن مجید اور ایک رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک ملت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہئے..... اب اس ملک میں غیروں کی حکومت نہیں۔ اب یہاں مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کا راج ہے۔

انہوں نے 18 اپریل کو 'ایڈورڈس کالج' پشاور کے پرنسپل' اساتذہ اور طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

ذرا سوچئے کہ کوئی شخص اس سے بڑھ کر اور کس چیز کی توقع کر سکتا ہے کہ یہ عظیم خطہ زمین' اس اقتدار کے تابع آ گئی ہے جسے اسلامی اقتدار کہا جاتا ہے۔

اور ان کی آخری تقریر وہ تھی جو انہوں نے یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں فرمائی۔ اس میں انہوں نے کہا:۔

ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول' مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا' ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغامِ امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا اور نوعِ انسان کی بہبود' مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

☆.....☆.....☆

اہم اطلاع

مطالب القرآن فی دروس الفرقان کی نئی جلد چھپ گئی ہے جو کہ سورۂ القمر' سورۂ الرحمٰن' سورۂ واقعہ اور سورۂ الحدید کے دروس پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب یکم دسمبر سے ادارہ طلوعِ اِسلام' لاہور سے دستیاب ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حافظ غلام مرشد مرحوم، سابق خطیب شاہی مسجد لاہور

قسط دوم

علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں

(مولانا) حافظ غلام مرشد تحریکِ پاکستان کے ان بلند مرتبت کارکنوں میں سے تھے جنہیں علامہ اقبال اور قائداعظم علیہم الرحمتہ کا اعتماد اور تقرب حاصل تھا۔ تحریکِ پاکستان کی حمایت میں جب جمعیت علماء اسلام کا قیام عمل میں آیا تو مولانا شبیر عثمانی کی علالت کے باعث قائداعظمؒ نے غلام مرشدؒ کو اس علماء اسلام کانفرنس کے افتتاحیہ خطبہ دینے کے لئے منتخب کیا۔ (مولانا) غلام مرشد نے پچاس سال تک لاہور میں درسِ قرآنِ کریم دیا۔ ذیل میں علامہ اقبالؒ سے ان کی چند ملاقاتوں کا احوال درج کیا جا رہا ہے جو انہوں نے قلم بند کرائی تھیں اور کئی عشرے پہلے فنون اور نقوش میں شائع ہوتی رہیں۔ (مدیر)

کیونکہ ان کو جو شکست ہوئی قرآن کی بدولت ہوئی۔ چنانچہ سب سے زیادہ جو حدیث مستند ترین کتابوں میں آئی وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے وصال تک کوئی بھی حصہ قرآن کا جمع نہیں ہوا۔ اور انہیں زیدؓ ابن ثابت کے ذریعے مشہور ہوا کہ آپ کے دور میں قرآن پاک اپنے طور پر بعض صحابہ کرام نے ہڈیوں پر، چیتھڑوں پر، پتوں پر اس کے کچھ حصے لکھوا رکھے تھے، جو سب سے پہلے جنگ یمامہ میں حفظ قرآن کی نعمت سے مالا مال ہوئے تھے۔ حفاظ وسیع پیمانے پر اس جنگ میں قتل ہوئے اور ان محدثین کے قول کے مطابق انہیں قرآن کریم کے مٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوا؛ حضرتؓ نے جمع قرآن کی تجویز حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی جو ردوقدح کے بعد منظور ہوئی۔ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی، جو اپنے طور پر قسم قسم کی لکھی ہوئی تحریریں پیش کریں اور ان کی نگرانی میں قراطیس بھی مل گئے۔ یہی نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے اور حضرت عمرؓ کی نگرانی میں رہا۔ انہوں نے وفات کے وقت اپنی صاحبزادی ام المومنینؓ حفصہ کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب عثمانؓ کو علم ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنے طور پر بھی قرآن کے بعض حصے اپنی خود ساختہ تفسیروں کے ساتھ بنا کر لکھ رکھے ہیں۔ لہٰذا حضرت ام المومنین حفصہؓ سے قرآن کا مستند نسخہ منگوا کر ایک بارہ آدمیوں کی کمیٹی میں پیش کر دیا اور حکم جاری کیا کہ جس جس کے پاس جو بھی قرآن کا حصہ لکھا ہوا ہے۔ وہ اس کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ پھر اس معیار پر جن کی اپنے طور پر تحریر کی ہوئی آیتیں اور تفسیریں منطبق نہ ہوئیں تو انہیں جلا کر راکھ کو دفن کر دیا اور اس مستند نسخے کی متعدد مستند نقلیں کروا کر اپنی سلطنت کے اسلامی ممالک کے ہر صوبے میں بھیج دیں اور گورنروں کو ہدایت کی کہ جو بھی عالم قرآن کے درس دینے پر متعین ہو۔ وہ اس نسخے کو پیش نظر رکھے اور اپنی وفات تک قرآن حکیم کے ان مستند نسخوں کو مدرسین کی تشریحات سے پاک رکھو اور اگر تم بضرورت تشریح کرو تو ان تشریحات کو قرآن حکیم کا جزو نہ بننے دو۔

ڈاکٹر اقبالؒ نے اس خاکسار کا امتحان لینے کی غرض سے تاریخی شہادت طلب فرمائی جس کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ قرآن کریم کی جمع اور ترتیب کو قرآن کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے تھے: جن ہدایات کو یہ شخص یعنی سرکار دو عالم ﷺ ہدایات خداوندی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری نظروں میں پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں اس نے لکھوالیا ہے اور جو صبح و شام اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ (سورۃ نمبر ۲۵ آیت نمبر ۵ پارہ ۱۹ رکوع ۱۴) اور اس تاریخی واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب مختلف ممالک کی طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں وفدوں کی شکل میں وفد آئے اور ان میں سے ایک ثقیف کا وفد تھا۔ سرکار دو عالمؐ اس وقت قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپؐ نے اپنا فرض تلاوت ختم فرمایا۔ تو ان سے معذرت کی کہ تمہیں میرے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑا جب میں اس قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتا ہوں اور جب تک اس حصے کو ختم نہ کرلوں میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ چنانچہ تم سے زیادہ تعداد میں لوگ مسجد میں قدیم ترین اور مخلص ترین مسلمان بھی انتظار میں تھے۔ وفد ثقیف نے گرویدگی اور محبت سے قرآن پاک کی روزانہ تلاوت کے متعلق پوچھا۔ آپ کی عادت پوچھی' تو فرمایا' ایک دن سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے سورۃ توبہ کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چوتھے دن سورۃ بنی اسرائیل سے شروع کر کے سورۃ الفرقان کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں' اور پانچویں روز سورۃ شعرا سے شروع کر کے سورۃ یٰسین کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چھٹے دن سورۃ والصافات سے شروع کر کے سورۃ الحجرات کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور ساتویں دن سورۃ ق سے لے کر سورۃ والناس کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں۔ یہ بے مثل قرآت صدیوں تک علماء کی نظر میں فہمی بشوق کے نام سے مشہور تھی۔ آپ (اقبال) کے دریافت فرمانے پر خاکسار نے عرض کیا کہ اس بے مثل قرآت کا تذکرہ صحاح ستہ میں سنن ابوداؤد میں موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ ان روایات کا کیا بنے گا۔ جن میں بڑے زور شور سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کا ولولہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جنگ یمامہ میں بہت سے قاریوں کے شہید ہونے سے پیدا ہوا۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں عرض کروں گا کہ یہ روایات بھی مسلمانوں کو قرآن کریم سے منحرف کرنے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔ بڑے زوردار الفاظ میں یہ اعلان موجود ہے کہ یہ انمٹ حقیقت اور ناقابل تردید صداقت ہے کہ صرف ہمیں نے اس قرآن کو اتارا ہے جو قیامت تک انسانوں کو ان کے فرائض کی یاددہانی کراتا رہے گا۔ اور یقیناً ہم ہی اس کی قیامت تک حفاظت کرتے رہیں گے اور عرض کیا کہ اس قسم کی احادیث قرآن کے مقابلے میں کون پیش کرسکتا ہے سوائے اس کے کہ فریب کار اپنی فریب کارانہ اور ابلیسیانہ شکل میں ایسی حدیثیں وضع کریں اور ہمارے سادہ لوح انسان ان پر بحثیں کریں۔ کسی میں حضرت ابوبکرؓ کی منقبت ہو۔ کسی میں حضرت علیؓ کی اور حدیثیں گھڑنے والے ان دونوں کے لئے متضاد حدیثیں وضع کرتے تھے' مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حیرانگی میں ڈالتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھ برس تک اس قسم کی احادیث کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لئے ان کے دور میں قرآن حکیم تھا اور جگہ جگہ اس کی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام تھا۔ وہاں قرآن حکیم نے جن اوامر اور نواہی کی کوئی خاص کیفیت' کمیت' ہیئت' اور وضع اور شکل متعین نہیں فرمائی اور

حضور علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ جو ان اوامر اور نواہی کی تفصیلات حالات کے مطابق آپ چاہیں متعین فرما دیں اور آپ کے متبعین کا فرض ہے کہ اس اسوہ حسنہ کی تعمیل کریں۔ ہاں اگر آپ کے جانشین اپنی مجلس شوریٰ کے ساتھ مل کر کچھ تبدیلی کرنا چاہیں، تو تبدیلی کر سکتے ہیں جیسے خود حضورؐ نے مال غنیمت کی تقسیم میں بدر سے لے کر حنین تک متبادل صورتوں میں تقسیم کیا۔ محدثین کے اسی جمع و تدوین کے کارنامے جو مسلمانوں کی محض سلف صالحین کی محبت کی وجہ سے سرانجام پائے وہ آخر پہلی دفعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ پھر اس جمع و تدوین کے سلسلے میں جب خارجی اور رافضی کے دو متضاد فرقے پیدا ہو گئے، جو افتراق سے قبل ان مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے جو صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں سے دو جنگیں جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے مشہور ہیں، ان دونوں جنگوں میں تقریباً نوے ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ اور جب ان کی منشا کے خلاف صلح ہو گئی۔ جو ان کے مشن کے خلاف تھی وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ حمایت کرنے والے شیعہ کہلائے اور شدید ترین مخالفت کرنے والے خارجی پھر ان کی آپس میں جنگ ہوئی، جسے جنگ نہروان کہتے ہیں۔ اور تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان، مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور وہ اپنے تفرقے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں جو احادیث کی صحت و عدم صحت کی منظم کوشش شروع ہوئی وہ بھی بے وقت ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔

(۳) علامہ اقبال مغفور نے اپنا خاص قاصد بھیج کر فوری طور پر پہنچنے کا حکم دیا۔ جب یہ خاکسار اس حکم کی تعمیل میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچا۔ دیندار علماء، وکلا، مخلص احباب، جن میں جج صاحبان بھی موجود تھے۔ خاص طور سے جسٹس دین محمد صاحب موجود تھے ان دنوں ان کے عقیدت مند دوست اور خدام ۱۹۲۶ء کے الیکشن کے لئے آپؒ کو پنجاب کونسل کی لاہور سیٹ سے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اتنے بڑے بزرگوں کے اجتماع کو دیکھ کر ایک گونہ حیرت بھی ہوئی۔ اور ایسے وقت میں یاد فرمائی پر تعجب بھی ہوا میرے جانے پر ان بزرگوں کے مجمع کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔ جو قرآن کریم کی بعض آیات کے منسوخ ہونے پر بحث فرما رہے تھے۔ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ علامہ نے پیار سے فرمایا "بدو مولوی میرے پاس آجاؤ اور تم بھی حصہ لو" میں نے دونوں طرف کے اکابر کی طرف اشارہ کرتے عرض کیا کہ آپ اور ان بزرگوں کی موجودگی میں اس نو عمر خاکسار کو جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے۔ اتنے اہم مسئلے میں کیسے حصہ لے سکتا ہے لیکن آپؒ نے فرمایا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ آپ بھی اس سلسلے میں اظہار خیال کریں۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپؒ کو اور ان بزرگوں کو معلوم ہے کہ قرآن کریم میں نسخ آیات کا ذکر ضرور موجود ہے بلکہ تبدیلی آیات کا بھی (سورۃ نمبر ۴۵ آیت نمبر ۲۹ پارہ ۲۵ رکوع ۲۰) تحویل و انتقال، ان معنوں میں بھی ان دونوں بزرگ جماعتوں کو معلوم ہے وراثت کی کتابوں میں تناسخ المیراث کا ایک مستقل باب ہے۔ یعنی ترکے کا انتقال غالباً اسی معنی کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک عقیدہ آواگون کا سلسلہ جاری ہے۔ تیسرا معنی ازالہ و محو، مٹا دینا (سورۃ نمبر ۲۲ آیت نمبر ۵۲ پارہ ۷ رعوع ۱۴) آیات خداوندی کا لفظ بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مناظر قدرت اور تاریخی قوموں کے آثار قدیمہ (سورۃ نمبر ۱۷ آیت نمبر ۲۲ پارہ ۱۵ رکوع ۲) و (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۱۔۱۲۔۱۳ وغیرہ) و (سورۃ نمبر ۲۶ آیت نمبر ۸ پارہ ۱۹ رکوع ۱) و آیت نمبر ۲۷ رکوع ۴، و آیت نمبر ۱۰۳ رکوع ۵، و آیت نمبر ۱۲۱ رکوع ۶ و آیت نمبر ۱۳۹ رکوع ۷ و

آیت نمبر ۱۵۸ رکوع ۸ و آیت نمبر ۱۷۴ رکوع ۹ و آیت نمبر ۱۹۰ رکوع ۱۰) سورۃ شعرا آیت نمبر ۱۲۹ سورۃ نمبر ۲۶) یہ آیت مثالیں ہیں۔

سلسلہ رسالت کے شروع ہونے سے لیکر آخر تک جو خدا کی طرف سے نبیوں کی وساطت سے قوموں کو ہدایات دی گئیں، چنانچہ حضرت آدمؑ کو جب وحی نبوت کے ذریعے چند انمٹ ہدائتیں دیں۔ تو ان کی تعبیر آیات اللہ سے کی (سورۃ نمبر ۲ آیت نمبر ۳۹ پارہ پہلا رکوع ۴ (و) سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۳۵ پارہ ۸ رکوع ۱۱ (و) سورۃ نمبر ۹ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۹ رکوع ۳) اور حضرت نوحؑ کے تذکرے میں (سورۃ نمبر ۹۱ پارہ ۱۱ رکوع ۱۲)۔

آپؐ کی تشریف آوری سے قبل انمٹ ہدائتیں اللہ پاک کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ سے دی گئیں۔ وہ تو ان کی وفات کے بعد ان کے خود غرض، دین فروش مذہبی پیشواؤں نے دولت مندوں اور حکومتوں سے پیسے بٹورنے کے لئے فراموش کر دیں اور عوام کے دلوں سے ان کے نقش و نگار مٹا دیئے۔ ان احکام خداوندی کی جگہ اپنی پیشوائیت کو قائم رکھنے کی غرض سے کچھ احکام خود گھڑ لئے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے کے مخترع احکام کی تعبیر بھی آیات ربانی سے کی اور انہیں آیات اللہ کہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر خدا کے پیدا کئے ہوئے بعض جانوروں اور زمین کی پیداوار کے ایک حصے کو اپنے خود ساختہ معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا اس طرح اپنی اولاد خصوصاً بعض بیٹوں کو قتل کر دینے کے احکام جاری کر دیئے اس سے دیوی اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ یہ ہدائتیں تھیں۔ اسی طرح بعض چار پاؤں پہ سواری یا ان سے کام لینے کو ممنوع قرار دے دیا اور بعض مردار جانوروں کا گوشت کھانا حلال ٹھہرا دیا اور بعض جانوروں سے استفادہ عورتوں کے لئے حرام کر دیا اور مردوں کے لئے حلال کر دیا (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۴۱۔۱۳۷ پارہ ۸ رکوع ۳) اس قسم کے افترا پردازانہ احکام کا تذکرہ (سورۃ نمبر ۵ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۷ رکوع ۴) اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لئے وقتی طور پر جو حکم جاری کیا کہ ناخن دار جانوروں اور گائیوں اور بکریوں کی مخصوص چربیوں کا استعمال تمہارے لئے حرام ہے (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۴۷ پارہ ۸ رکوع ۵ (و) سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۱۰۷ پارہ ۶ رکوع ۲) اس قسم کے وقتی احکام کو بھی مذہب کا دائمی حکم ٹھہرا دیا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منسوخ شدہ آیتوں سے قرآن کی آئتیں مراد نہیں، بلکہ پہلے مذہبی پیشواؤں کے من گھڑت احکام کا نسخ یعنی ملیا میٹ کرانا مراد ہے اور جن احکام خداوندی کو انہوں نے اپنی دین فروشی کے ماتحت دین فروشی کی غرض سے یعنی مذہبی سیادت کو قائم رکھنے کی غرض سے اپنے عوام کے دلوں سے ان کے نقوش تک مٹا دیئے تھے۔ میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور قرآن نے انمٹ اور ابدی احکام جن کے نقوش تک یہ مذہبی پیشوا مٹا چکے تھے۔ انہیں صحیح شکل وصورت میں کر دیا جنہیں تمام پیغمبر پیش کرتے رہے تھے۔ سب سے زیادہ زور قرآن نے شرک کے مٹانے پر دیا۔ جسے تمام پیغمبر اپنے اپنے وقت میں مٹاتے رہے وہ شرک شفاعت میں ہو یا عبادت میں ہو یا حکم میں ہو قرآن نے سارا زور اسی پر دیا ہے۔ قرآن نے ان کی خود ساختہ اور ان کے مذہبی دین فروش پیشواؤں کے احکام جو خدا کے نام پر پیش کرتے تھے جن سے وہ بگڑ کر معاذ اللہ آپؐ پر افترا پردازی کی تہمتیں لگاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۰۱ پارہ ۱۴ رکوع ۲۰) کہ جب بدلتے ہیں ہم کسی حکم کو ان کے خود ساختہ مذہبی احکام کی جگہ تو وہ چیخ چیخ کر یہ پکارتے ہیں

''کہ تو فقط افترا پرداز ہے اگلی چار آیتوں میں ان کی افترا پردازیوں کی مزید تفصیل فرمائی ہے اور (سورۃ نمبر ۲۲ کی آیت نمبر ۵۲ پارہ ۱۷ رکوع ۱۴) بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان فرما دیا کہ ہم نے تم سے پہلے جب کبھی اپنا رسول بھیجا اور اس نے اپنی قوم کو میری آیتوں کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا' تو شیطان سیرت مذہبی پیشواؤں نے آیات کے سلسلے میں اپنے مروجہ احکام کی آڑ لے کر ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لیکن ہم نے ان کی رکاوٹوں کو ملیامیٹ کر دیا اور پھر اپنے رسول کے ذریعے دی ہوئی انمٹ ہدایتوں کو لوگوں کے دلوں میں مستحکم اور مضبوط منقش کر دیا اور پارہ پہلا سورۃ دو کے پہلے رکوع کی پہلی آیت میں مسلمانوں کو حضورؐ کے حق میں ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کے لئے سختی سے مخالفت فرمائی' بلکہ اس کو کفر قرار دیا۔ رکوع کی دوسری آیت میں یعنی ۱۰۵ میں اہل کتاب اور مشرکوں کو بدترین دشمنی اور افترا پردازی سے فراموش کرائے ہوئے کسی حکم کو فراموش ہو جانے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ تو ان سے بہتر یا ان جیسا حکم تمہارے ذریعے لوگوں کیسامنے پیش کرتے ہیں۔ یعنی ان کے افترائی احکام میں جو کسی موزوں شکل میں قائم رکھے جا سکتے تھے انہیں اچھی سے اچھی شکل دے کر پیش کر دیتے اور جو کسی ہیئت صورت' کیفیت کی تبدیلی کے قابل نہیں ہوتے۔ انہیں سرے سے مٹا کر ان کی جگہ بہتر سے بہتر احکام صادر فرما دیتے ہیں۔ خاکسار کی یہ تقریر میر محفل کے احترام کی وجہ سے نہایت خاموشی سے سنی گئی۔ مگر آپ (اقبال) نے فرمایا کہ آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ کیسے پیدا ہو گیا؟ خاکسار نے عرض کیا کہ نسخ پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں خود ان میں سے علمائے کرام کے ایک فریق نے یہ تسلیم کیا ہے ان آیات میں ان احکام کی نسخ کا ذکر ہے جو پہلی امتوں کے پاس من گھڑت مذہبی احکام یا وہ فروعات ہیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا تذکرہ آٹھویں یا پانچویں پارہ کی سابقہ آیات میں عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن نے پیش کی ہے (سورۃ نمبر ۳ آیت نمبر ۴۹ پارہ ۳ رکوع ۱۲) میں نے اپنی بساط کے مطابق اس مسئلے پر مسلمانوں کی جو کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں مشہور کتاب 'الناسخ والمنسوخ' الامام ابو جعفر النحاس التوفی ۳۳۸ ہجری مطبوعہ مصر (۱۳۲۳) اس کے بغور مطالعہ کرنے سے یہ چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ پورے قرآن میں کسی آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنے کا تذکرہ تک نہیں۔

۲۔ کسی آیت کے منسوخ ہونے سے متعلق یا ناسخ ہونے کے متعلق کوئی ایسی روایت (نہیں جو) صحیح ہو۔

۳۔ صحابہ کرام کے نام پر موقوف روائتیں موجود ہیں' لیکن متضاد۔

۴۔ پہلے پارے کی نسخ کی آیت کے ساتھ نسیان آیات کا بھی ذکر ہے جس کی خود قرآن کریم نے بڑے زوردار الفاظ میں تصدیق کر دی ہے۔

خدا کی پڑھائی ہوئی آیتوں کے متعلق حضور ﷺ کا نسیان کا شکار ہونا خود قرآن کریم کے اعلان کے خلاف ہے (سورۃ ۸۷ آیت نمبر ۶ پارہ ۳۰ رکوع ۱۲)۔

۵۔ منسوخ آیات قرآنی معاذ اللہ کی مخترع تعداد میں بے حد اختلاف ہے چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے (سورۃ احزاب ۳۳) سورۃ

بقرہ کے برابر تھی' حالانکہ سورۃ بقرہ کی آیتوں کی تعداد ۲۸۶ ہے اور سورۃ احزاب کی صرف ۷۳' جو سیکڑوں سے متجاوز ہو جانے کے بعد پھر گھٹنی شروع ہوئی۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں ان کی منسوخ آیتوں کی تعداد بیس متعین کی اور انہوں نے اسے اپنی کتاب میں منظم شکل میں پیش کیا۔ ستائیسواں حصہ ۳۱۴' بعض بزرگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فرمایا کہ جابر کافروں کے ظلم وستم سہتے ہوئے صبر کرنے کا حکم دیا تھا ان ایک سو چوبیس آیتوں کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض بزرگ اس کار خیر میں عجیب بات لکھ گئے کہ (سورۃ نمبر ۷ کی آیت نمبر ۱۹۹ پارہ ۹ رکوع ۱۴) تین فقروں کی جو آیت ہے۔ ان میں سے دو فقرے منسوخ اور درمیانہ فقرہ غیر منسوخ۔

۶۔ نسخ کا سوال آیات کے تضاد پر موقوف ہے اور قرآن کریم نے تضاد کی پوری نفی کر دی ہے۔ بلکہ خود قرآن نے تضاد نہ ہونے کو اپنے کلام کی دلیل بنایا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ ۵ رکوع ۸) اور تضاد کے متعلق علم ادب وعلم منطق کا یہ فیصلہ ہے:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدت موضوع و محمول ومکاں
(مبتدا وخبر)
وحدت شرط و اضافت جزو کل
قوت و فعل است در آخر زماں

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اعلان فرمایا کہ اس اہم مضمون کی تکمیل آئندہ ملاقات میں ہوگی (یعنی آٹھ دن کے بعد) بعض جدید و قدیم تعلیم یافتہ بزرگوں نے عرض کیا کہ ہمیں چند سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ اس کا بھی اسی دن موقع ملے گا۔ یعنی آٹھ دن کے بعد:

سب سے پہلے ان بزرگوں نے اپنے افکار اور سوالات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مجھے ارشاد فرمایا جس پر میں نے عرض کیا کہ ان بزرگوں کے ارشادات زیادہ تر اس بحث کے متعلق ہیں جو ہمارے پیشواؤں نے کتابیں لکھی ہیں' ان پر مبنی ہیں اور کسی بزرگ نے کسی آیت قرآنی کے نسخ کے متعلق نہ تو قرآن کریم کی کسی آیت کو پیش فرمایا ہے اور اپنی عقیدت مندی کی بنا پر غیر معصوم بزرگوں کے اقوال درج کئے ہیں ایک طرف تو وہ متضاد ہیں جو کسی ایک آیت کو منسوخ کہہ رہا ہے دوسرا اس کو ناسخ بتلا رہا ہے جس کی شہادت میں خاکسار اپنے ساتھ کتاب' الناسخ والمنسوخ' مصنفہ ابو جعفر نحاس متوفی ۳۳۹ ہجری اور امام ابن خذیمہ کی کتاب' الناسخ والمنسوخ مطبوعہ مصر لے کر گیا تھا۔ ان کے صفحات پڑھ کر سنائے' جن میں سے ایک ایک آیت کے نسخ کے سلسلے میں بڑے بڑے اماموں کے پانچ پانچ اقوال ہیں جن پر ایک جگہ خود علامہ ابن نحاس نے یہ لکھا کہ کسی آیت قرآنی کو اس وقت تک منسوخ نہیں کہا جا سکتا جب تک کوئی دوسری آیت قرآنی جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے' اس کی ہر حیثیت سے متضاد نہ ہو (کتاب الناسخ والمنسوخ (۱۲) اور یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی دو آیتوں کا ملنا محال ہے اور قرآن اسی عدم تضاد کو انمٹ احکام خداوندی کا مجموعہ ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ

بقرہ کے برابر تھی' حالانکہ سورۃ بقرہ کی آیتوں کی تعداد ۲۸۶ ہے اور سورۃ احزاب کی صرف ۷۳' جو سیکڑوں سے متجاوز ہو جانے کے بعد پھر گھٹنی شروع ہوئی۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں ان کی منسوخ آیتوں کی تعداد بیس متعین کی اور انہوں نے اسے اپنی کتاب میں منظم شکل میں پیش کیا۔ ستائیسواں حصہ ۳۱۴' بعض بزرگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فرمایا کہ جابر کافروں کے ظلم وستم سہتے ہوئے صبر کرنے کا حکم دیا تھا ان ایک سو چوبیس آیتوں کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض بزرگ اس کار خیر میں عجیب بات لکھ گئے کہ (سورۃ نمبر ۷ کی آیت نمبر ۱۹۹ پارہ ۹ رکوع ۱۴) تین فقروں کی جو آیت ہے۔ ان میں سے دو فقرے منسوخ اور درمیانہ فقرہ غیر منسوخ۔

۶۔ نسخ کا سوال آیات کے تضاد پر موقوف ہے اور قرآن کریم نے تضاد کی پوری نفی کر دی ہے۔ بلکہ خود قرآن نے تضاد نہ ہونے کو اپنے کلام کی دلیل بنایا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ ۵ رکوع ۸) اور تضاد کے متعلق علم ادب وعلم منطق کا یہ فیصلہ ہے:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدت موضوع و محمول ومکاں
(مبتدا وخبر)
وحدت شرط و اضافت جزو کل
قوت و فعل است در آخر زماں

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اعلان فرمایا کہ اس اہم مضمون کی تکمیل آئندہ ملاقات میں ہوگی (یعنی آٹھ دن کے بعد) بعض جدید و قدیم تعلیم یافتہ بزرگوں نے عرض کیا کہ ہمیں چند سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ اس کا بھی اسی دن موقع ملے گا۔ یعنی آٹھ دن کے بعد:

سب سے پہلے ان بزرگوں نے اپنے افکار اور سوالات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مجھے ارشاد فرمایا جس پر میں نے عرض کیا کہ ان بزرگوں کے ارشادات زیادہ تر اس بحث کے متعلق ہیں جو ہمارے پیشواؤں نے کتابیں لکھی ہیں' ان پر مبنی ہیں اور کسی بزرگ نے کسی آیت قرآنی کے نسخ کے متعلق نہ تو قرآن کریم کی کسی آیت کو پیش فرمایا ہے اور اپنی عقیدت مندی کی بنا پر غیر معصوم بزرگوں کے اقوال درج کئے ہیں ایک طرف تو وہ متضاد ہیں جو کسی ایک آیت کو منسوخ کہہ رہا ہے دوسرا اس کو ناسخ بتلا رہا ہے جس کی شہادت میں خاکسار اپنے ساتھ کتاب' الناسخ والمنسوخ' مصنفہ ابو جعفر نحاس متوفی ۳۳۹ ہجری اور امام ابن خذیمہ کی کتاب' الناسخ والمنسوخ مطبوعہ مصر لے کر گیا تھا۔ ان کے صفحات پڑھ کر سنائے' جن میں سے ایک ایک آیت کے نسخ کے سلسلے میں بڑے بڑے اماموں کے پانچ پانچ اقوال ہیں جن پر ایک جگہ خود علامہ ابن نحاس نے یہ لکھا کہ کسی آیت قرآنی کو اس وقت تک منسوخ نہیں کہا جا سکتا جب تک کوئی دوسری آیت قرآنی جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے' اس کی ہر حیثیت سے متضاد نہ ہو (کتاب الناسخ والمنسوخ (۱۲) اور یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی دو آیتوں کا ملنا محال ہے اور قرآن اسی عدم تضاد کو انمٹ احکام خداوندی کا مجموعہ ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ

پارہ نمبر۴ رکوع ۸) اور ہمارے ان بزرگوں نے جن غیر معصوم بزرگوں کی کتابوں کو اعتماد کی سند دے رکھی ہے ان میں سے امام بخاریؒ کی ایک حدیث نقل کی ہے جو بظاہر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ پر وہ پیش فرمائی ہے۔ اگر اس کو مرفوع بھی فرض کیا جائے تو خود اس کے دونوں جملوں میں تضاد ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ شادی شدہ زنا کاروں کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد ان کو سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن میں اس پر بھروسا رکھ کر قرآن میں لکھوانا چاہتا ہوں اور نہ اس کے لکھنے کو حضورؐ نے پسند فرمایا۔ اس تضاد کی موجودگی میں اس غیر یقینی روایت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے اور قرآن میں موجود بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی آیت یا سورت حضورؐ پر نازل ہوتی تھی تو ایک طرف تو معجزانہ رنگ میں حضورؐ کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف حضورؐ اسی قرآن کریم کی کتابت کرنے والوں میں سے جو بزرگ ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے ان سے لکھوا لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جب مکہ معظمہ میں سرکار دو عالم پر سورۃ نمبر ۶ بیک وقت نازل ہوئی جس کی آیتیں ایک سو چھیاسٹھ ہیں اور رکوع بیس ہیں' اس وقت حضورؐ نے قرآن کریم کے جو کاتب ڈیوٹی پر تھے۔ اسی ترتیب سے پڑھ کر جس طرح خداوند کریم نے پڑھائی تھی لکھوا دی ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں یہ موجود ہے کہ یہودی حضورؐ کی عدالت میں شادی شدہ زنا کار مرد اور عورت کو لائے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا کیونکہ حضورؐ نے ہر مذہب کی رعیت کو اجازت دے رکھی تھی۔ کہ ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا ان کے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا' تو حضورؐ نے پوچھا کہ تمہاری مذہبی کتاب تورات میں اس جرم کی کیا سزا لکھی ہے تو انہوں نے غلط بیانی سے کام لے کر کہا کہ ہم اس کو کوڑوں کی سزا دیتے ہیں اور اسے رسوا کرتے ہیں۔ اسی محفل میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ موجود تھے۔ جو پہلے پکے یہودی عالم تھے۔ ان کی اس غلط بیانی کو وہ برداشت نہ کر سکے اور عرض کیا کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ تورات منگوائی گئی اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس میں سے رجم کی آیت پڑھ کر سنائی۔ اس ثبوت کے مل جانے کے بعد حضورؐ نے تورات کی آیت رجم کے مطابق ان کو سزا دی۔ آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان بزرگوں نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں کوئی ایک حدیث مرفوع صحیح تک موجود نہیں ہے۔ چہ جائیکہ قطعی ہو اور خود ان بزرگوں نے اپنے غیر معصوم مذہبی پیشواؤں کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ انہیں میں یہ درج ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور نہ کسی آیت نے اس کو منسوخ کیا یعنی قرآن کی کسی آیت نے کسی آیت کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ کتابی اور غیر کتابی غیر مسلم جماعتوں کے گم راہ کن زر پرست مذہبی پیشواؤں نے اپنے من گھڑت احکام کو خدا تعالیٰ کے احکام کا نام دے رکھا تھا۔ اور دیدہ و دانستہ خدا پر افترا باندھتے تھے۔ جہاں تک جن انمٹ احکام کی خداوند کریم نے ہر رسول کے ذریعے ہر مذہب کی تعلیم دی تھی وہ بھی انہوں نے فراموش کر دی۔ چنانچہ سب سے بڑا حکم جو ہر نبی کے ذریعے خداوند کریم نے دیا وہ توحید فی الصفات توحید فی العبادت اور توحید فی الحکم کا حکم دیا تھا۔ وہ انہیں ایسا فراموش ہوا۔ کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدا تعالیٰ کے صفات و عبادت و حکم میں شریک کر دیا (تفسیر اتقان تصنیف امام سیوطی شافعی ۸۷۸ ہجری و مطبوعہ ۱۲۸۰ھ مطبع احمدی دہلی صفحہ ۳۱۲۔۳۱۳۔۱۳۴) میں موجود ہے۔

اس گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

(۵) ۲۶ کے الیکشن میں خاکسار بھی دوسرے مخلص ورکروں کی طرح شامل تھا تقریباً ہر انتخابی جلسے میں جہاں ملک لال دین قیصر لکے زئی اپنی شاعرانہ سحر بیانی سے ان محفلوں کو گرما دیتے تھے۔ خاکسار بھی اپنی استطاعت کے مطابق ان محفلوں کو آرائیں اور کشمیری برادری کے سوالات سے بالاتر رہنے کی تلقین کرتا تھا میں اس الیکشن کو اسلام اور کفر کا مقابلہ کہہ کر تعارف کراتا تھا۔ ملک محمد دین آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور علامہ اقبالؒ مرحوم کا تعلق کشمیری برادری سے تھا ان کو معلوم تھا کہ آرائیں برادری کے ووٹوں کی تعداد اس حلقے میں کشمیری برادری سے کہیں زیادہ ہے۔ اس واسطے میں آرائیں اور کشمیری تفرقے سے بالاتر رہ کر علامہ مغفور کی حمایت میں اپیل کرتا تھا۔ اس عرصے میں متعدد مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کیونکہ ہر رکن ان کے فرمان کے بموجب ہر روز اپنی اپنی کارکردگی پیش کرتا تھا۔ اور یہ روئداد سنتے تھے اور تبادلہ خیالات کرتے تھے ایک دن رات کے دس بجے ان کا نمائندہ خاکسار کے مکان پر تشریف لایا اور حکم دیا کہ آپ کو علامہ صاحب نے صبح یاد فرمایا ہے ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر بلوا بھیجنے کی حکمت معلوم ہوئی۔ بڑے مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں یہ سوال فرمایا کہ آپ نے خلافت کمیٹی کا عہدہ دار ہونے باوجود تحریک ہجرت کی مخالفت کیوں کی؟ میں نے عرض کیا کہ خاکسار اس تحریک کو گاندھی مہاراج کی ایک بدترین چال سمجھتا تھا' کہ جو ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں انہیں تو شدھ کر لیا جائے گا۔ باقی جو ہیں ان کو دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ کابل میں جا کر رہیں یا روس میں رہیں یا مکہ مدینہ جا کر رہیں۔ یہاں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں۔ ان کو یہ چیز بڑی ناگوار گزری۔ مگر مجمع میں سکون رہا اور میں نے عرض کیا کہ یہ ہجرت پر آمادہ کرنے والے بڑے معزز اراکین خود کیوں ہجرت نہیں فرماتے اور مجمع کو کہا کہ بلاشبہ ہجرت ناقابل برداشت مظالم کے وقت ایک مستحسن فعل ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم حکومت کے ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملک میں جائیں۔ اس غرض سے جائیں کہ ہم اس ملک میں پناہ گزیں ہو کر قرآن حکیم کی انمٹ ہدایتوں کے مطابق باعزت زندگی گزاریں گے جس کی مثال ہجرت حبشہ ہے۔ حضورؐ نے بھی اس کی اجازت دے دی تھی۔ مگر آپؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تک شدید ترین مظالم توڑنے والی حکومت بدل نہ جائے اور منصفانہ حکومت قائم نہ ہو جائے اس وقت تک اس ملک میں واپس نہ آئیں ورنہ یہی ہجرت ان کے لئے بدترین ابدی سزا کا موجب ہوگی۔ چنانچہ جہاں مہاتما گاندھی اور ان کے ہم خیال ہم مسلک ان کے چیلے مسٹر پٹیل اور پنڈت نہرو وغیرہ نے شدھی والوں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لئے امداد دی اور ہر صوبے میں' ہر بڑے شہر میں وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ جن میں سے ایک لاہور کا مشہور ترین فساد حویلی کابلی مل متصل ڈبی بازار و چوک سرجن سنگھ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا اور سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس فساد میں مسلمانوں نے کافروں کا رویہ اختیار کیا اور کافروں نے مسلمانوں کا یعنی جس پر ہاتھ اٹھاؤ اسے جان سے مار ڈالو۔ (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۴ پارہ ۲۶ رکوع ۵)۔

اس ناپسندیدہ روش کے نتیجے میں جن ہندو اور مسلمانوں کے چالان ہوئے۔ مسلمانوں ہی کی عدالتوں نے پھانسی کی سزا دی جن میں چنگڑ محلے کا مقدمہ دنیا میں مشہور ہے۔ انہیں ملک گیر فسادات کے دور میں جو مسلمان ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے۔ انہیں

کابل کی سرحد پار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس پر علامہ اقبالؒ بہت ہنسے اور فرمایا کہ قبوں کے گرانے کے خلاف یہاں جو تحریک چلی تھی اس کی تم نے کیوں مخالفت کی۔ حالانکہ سب مسلمان ماتم منا رہے تھے اور تم اکیلے آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ نجدیوں کے جد اعلےٰ امام عبدالوہاب نجدی توحید کے مسئلے میں بڑے متشدد تھے اور یہاں تک کہ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا بھی ان کے نزدیک مشرکانہ فعل تھا۔ ممکن ہے کہ اسی تشدد کے ماتحت شریف حسین جیسے لوگوں نے مزاروں اور ان پہ بنے ہوئے قبروں کی زیارت کو جانے والوں کو مشرکانہ حرکات سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ کام کیا۔ کیونکہ نجدیوں سے پہلے حجاز کی امارت کا شرف شریف حسین کو تھا جو کہ عرب ممالک میں ترکوں کا اقتدار ختم کرنے میں بڑا دخل تھا اور جو بدترین چال باز انگریز کرنل لارنس سال ہا سال تک اسلام کا مقدس لباس پہن کر ترکوں کے خلاف فضا سازگار کرتا رہا جسے یہ عرب عقل مندی سے شیخ کویت کے نام پکارتے تھے۔ جب حرمین شریفین میں وہ اسلامی لباس اوڑھ کر اسلامی رسوم کے طور پر نماز ادا کرنے کو آتا تھا۔ تو حرم شریف کی مسجد کے امام صاحبان اس کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ اور شریف حسین اور اس کے صاحبزادوں پر انگریز کا مطلب بر آری کے بعد اعتماد نہ رہا۔ تو نجدیوں کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی شریف حسین کی کوئی سازش ہو۔ تاکہ ہند کے عوام نجدیوں کے خلاف ہو جائیں۔ اس طرح انگریز کی پھیلائی ہوئی خبروں متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تمام کی تمام صحیح ہوں۔ مگر ان مشکوک خبروں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ تحریک اس وسیع پیمانے پر چل نکلی تھی کہ جگہ جگہ انگریز کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنا پڑی۔ اس لئے نجدیوں کی حمایت میں جو مولانا ظفر علی خان نے جلسہ کرنا چاہا۔ تو وہ جہانگیر کے مقبرے کے صحن میں ہوا۔ خاکسار بھی تماش بین کے رنگ میں اس جلسے کو دیکھنے گیا مولانا ظفر علی خان مرحوم نے مجھے دور سے دیکھا تو اسٹیج پر بلا لیا اور تقریر کرنے کی فرمائش کی میں نے وہاں مختصر تقریر کی جو زمیندار اور دوسرے اخباروں کے فائلوں میں محفوظ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

اگر نجدی والئی حرمین شریفین کی حیثیت سے، سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے اور ان مشرکانہ رسوم کو مٹانے کی کوشش کرنے تو سب سے پہلے ان مشرکانہ رسوم میں جو لوگ مبتلا تھے ان کے دلوں میں سے شرک اور کفر کے قبے گراتے تو ان سے مضبوط اور مضبوط تر قبوں کے مٹ جانے کے بعد وہ لوگ پتھروں، اینٹوں کے قبے خود مٹا دیتے۔ نبوت کے اکیس سال کے بعد جب مکہ شریف فتح ہوا تو بعض مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ کعبے کی یہ عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عمارت کے خلاف ہے۔ خلیل اللہ کی عمارت کو کعبے کی موجودہ عمارت کے جس حصے کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ اسے حطیم کہتے ہیں۔ اسے بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرز پر بنا دیں۔ جس طرح آپؐ نے بتوں سے کعبے کو پاک کیا ارشاد فرمایا کہ یہ تعمیر اس وقت ہوئی جب میری عمر پینتیس برس تھی اور میں نے خود ایک مزدور کی حیثیت میں اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مجھے اس کے حصے کے چھٹ جانے کا علم ہے وجہ کا بھی علم ہے۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

ساتویں قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

انسانی آنکھ کی حساسیت کے ضمن میں ہم نے دیکھا کہ انسان تقریباً 72,95,000 مختلف رنگوں میں فرق کو محسوس کرسکتا ہے۔ قرآن پاک نے بھی رنگوں کی مختلف اقسام کو بڑی اہمیت دی ہے۔ قرآن پاک میں مختلف زبانوں اور مختلف رنگوں (السنہ اور الوان) کو صاحبانِ علم وبصیرت کے لئے ادراکِ حقیقت کی نشانیاں (آیات) قرار دیا گیا ہے 30:22۔ زمین کی پیداوار میں مختلف رنگوں کو بھی معجزہ کہا گیا ہے 16:13۔ مختلف اور رنگا رنگ کھیتیاں، مختلف رنگوں کے پھل، پہاڑوں میں مختلف رنگ کے پتھروں کی تہیں، انسانوں، جانوروں اور چوپاؤں کے مختلف رنگوں پر اہل علم وبصیرت تحقیق کرکے اور اس عمل میں کارفرما قوانین کی عظمت کو دیکھ کر لرز اٹھتے ہیں یہی لوگ ''علما'' ہیں 35:27-28، 39:41۔ ان آیات میں ایک اور حقیقت بھی پوشیدہ ہے جسے ڈاکٹر بک (Buck) نے اپنی تصنیف 'Cosmic Conciousness' میں یوں منکشف کیا ہے۔ ''دورِ حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھا جائے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں کو پہچانتی تھی۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہوا اتنی ہی اس کی ذہنی سطح ہوگی۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسانی ذہن کے نشوونما سے خاص تعلق ہے''۔

انسانی آنکھ کی حساسیت کا اندازہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ہوا کو آلودگی سے پاک کرکے دیکھا جائے تو انسان موم بتی کے شعلے کو 27 کلومیٹر کے فاصلے پر دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح روشنی کو اگر 0.0003 سیکنڈ کے لئے پیش کیا جائے تو انسانی آنکھ اس کا بھی ادراک کرسکتی ہے۔ قدیم زمانے میں روشنی کو ایک طلسمی اور پراسرار غیر مادی شے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جدید دور کے سائنسدانوں نے پرانے مفروضوں کی جگہ روشنی کا تموج (Wave) اور روشنی کا کوانٹم نظریہ پیش کیا یعنی (Quantum Theory of Light) مطلب یہ کہ روشنی توانائی کے انفرادی پیکٹوں کی صورت میں خارج اور جذب ہوتی ہے۔ جنہیں فوٹون یا کوانٹا (Photon/Quanta) کہتے ہیں ہر فوٹون یا کوانٹا کا ایک تعدد ہوتا ہے اور اس کی توانائی کا انحصار روشنی کی موجوں کے تعدد پر ہوتا ہے۔ یعنی جتنا لہروں کا تعدد زیادہ ہوگا، اتنی ہی فوٹوں کی توانائی زیادہ ہوگی۔ مثلاً بنفشی رنگ کی روشنی کے لئے ایک فوٹون کا تعدد سرخ روشنی کے ایک فوٹون سے دگنا ہوگا اور یوں اس کی توانائی بھی دگنی ہوگی۔ (تفصیل میرے مضمون کوانٹم تھیوری'' طلوع اسلام بابت فروری 2013ء میں دیکھی جاسکتی ہے)۔ روشنی توانائی کی ایک قسم ہے جو ذراتی (Particle) اور موجی (Wave) دونوں قسم کی خاصیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ روشنی کو

طول موج (Wave Length) کی صورت میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ طول موج میں ایک ذرہ ایک دوری حرکت پوری کرتا ہے۔ چنانچہ موج جو فاصلہ طے کرتی ہے وہ طول موج کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی اکائی میٹر کا ایک نہایت ہی ادنی حصہ ہے جسے ملی مائیکرون یا نینو میٹر (Nanometer) کہتے ہیں یہ میٹر کا ایک ارب واں حصہ یعنی INM 10^{-9} لہٰذا ایک میٹر کا ایک کوانٹم یا فوٹون جو 500M روشنی پر مشتمل ہے اس کی طول موج $500x10^{-9}$ m ہوگی۔ اس طرح اس کا تعدد (Frequency) ایک کھرب فی سیکنڈ سے بھی زیادہ ہوگا اور اس کی توانائی بھی کئی ہزار کھرب سے زیادہ ہوگی۔ ایک اندازے کے مطابق ایک پچاس واٹ کا بلب کئی ہزار کھرب کوانٹم یا فوٹون فی سیکنڈ ظاہری روشنی خارج کرتا ہے۔ طول موج کی حد جو انسانی بصارت کے نظام میں اشارات میں تبدیل ہوتی ہے وہ نا قابل یقین حد تک کم یعنی 400 سے 700 نینو میٹر یا ملی مائیکرون ہے۔ یہ سائنسی اندازے ہیں جن میں کمی بیشی کا امکان ہے۔

انسانی شخصیت کی تشکیل میں انسان کی مختلف صلاحیتوں اور ذہانت کا بھی اہم کردار ہے۔ انسان کی شخصیت ایک وحدت ہے لیکن یہ وحدت کوئی جامد شے نہیں اس میں جسمانی اور ذہنی نشوونما کا عمل جاری رہتا ہے۔ ذہنی نشوونما کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شخصی نشوونما کا ہر دور یکساں اہم ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے' جس میں پیدائش سے نوجوانی تک کہیں ٹھہراؤ نہیں آتا۔ انسان میں بے شمار صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ماہرین نفسیات نے ان صلاحیتوں میں پائے جانے والے عوامل تلاش کر کے ان کی بنیاد پر چند بنیادی صلاحیتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ لیکن ان میں بھی انفرادی تفریق پائی جاتی ہے۔ ان بنیادی صلاحیتوں میں میکانکی صلاحیت' مکانی صلاحیت' عددی صلاحیت' لفظی صلاحیت' موسیقی کی صلاحیت اور کھیل وغیرہ کی صلاحیت شامل ہیں۔ ان میں ہر صلاحیت کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً مکانی صلاحیت سے مراد کسی چیز کا صحیح مقام متعین کرنا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم کہاں کھڑے ہیں' قطب شمالی کس طرف ہے' کسی کمرے میں چیزیں کس طرح پڑی ہیں' کمروں کا رخ کس طرف ہے' کسی جگہ کی لمبائی' چوڑائی اور گہرائی کتنی ہے' ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اگر مختلف چیزوں کو خاص انداز میں رکھا جائے تو اس کی شکل کیسے بنے گی وغیرہ وغیرہ۔ جیومیٹری کے علم سے مکانی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں اور یہ نشوونما یافتہ صلاحیتیں مختلف شعبہ جات میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً جغرافیائی سروے کرنا' کسی گھر' شہر یا پارک کا ڈیزائن بنانا اور کوئی تصویر یا ماڈل بنانا وغیرہ۔ مکانی صلاحیت میں تخیل کا بہت دخل ہے۔ کیونکہ ماہر فن تعمیر یا ڈیزائنر کو پہلے نقشہ یا ڈیزائن کو اپنے ذہن میں لانا ہوتا ہے جسے وہ بعد میں کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور پھر اس کی عملی شکل سامنے آتی ہے۔ اس لئے جن افراد کی تخیلاتی سوچ کو پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملتا' ان کی مکانی صلاحیت عموماً نشوونما نہیں پاتی۔ یہی حال دیگر صلاحیتوں کا بھی ہے کسی صلاحیت کی نشوونما کی جائے تو اس کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تجزیے میں ہم نے دیکھا کہ ایک بنیادی صلاحیت میں درجنوں دیگر صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں اور یوں ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے لیکن یہ بھی حتمی نہیں۔

انسانی بچہ جبلتیں اور صلاحیتیں پیدائشی طور پر ساتھ لاتا ہے۔

پروفیسر ساجدہ نے البتہ صلاحیتوں کی دو اقسام بتائی ہیں۔ ایک عام قسم اور دوسری خاص قسم۔ وہ کہتی ہیں ''ذہانت میں جو امکانی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں انہیں ہم ''ذہنی صلاحیتیں'' کہتے ہیں جن میں بعض ''عام ذہنی صلاحیتیں'' ہوتی ہیں جو ہر شخص کو قدرت کی طرف سے (کم وبیش) ودیعت کی گئی ہیں۔ اور بعض صلاحیتیں ہوتی ہیں جو انفرادی ہوتی ہیں''۔ انہوں نے مشاہدہ' ادراک' تجسّس' نئی اشیاء کا سمجھنا' فہم' تصور' تخیل اور معلومات کے ذخیرے کو ذہن میں جمع کرنے کی صلاحیت وغیرہ کو عام صلاحیتیں اور تخلیقیت' مصوری' شاعری' نقاشی' موسیقی' صلاحیتِ حساب' زباندانی' صلاحیت رقص وسرود' صلاحیت تجربہ اور صلاحیت تخیل وتجزیہ وغیرہ کو مخصوص صلاحیتیں ظاہر کیا ہے۔ لیکن دیگر ماہرین نے' جیسا کہ اوپر ہم نے دیکھا' ان صلاحیتوں میں کوئی فرق ظاہر نہیں کیا۔ دراصل جب کوئی فرد کسی بھی صلاحیت کی نشوونما کر کے اس میں ماہر بن جاتا ہے تو اس کے لئے یہ صلاحیت مخصوص بن جاتی ہے۔ ورنہ کوئی بھی انسان اپنی کسی بھی صلاحیت کی نشوونما کر سکتا ہے۔ پروفیسر صاحبہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی صلاحیت کسی فرد میں بھی ہوسکتی ہے' کئی بھی ہوسکتی ہیں۔ ان کے مطابق ذہنی نشوونما انہی صلاحیتوں کی نشوونما اور ترقی کا نام ہے۔ کیونکہ ان کا وجود ان کے ارتقاء پر ہی منحصر ہے۔ ارتقاء کے بغیر ان مخصوص صلاحیتوں کا صرف امکان ہے وجود واثبات ممکن نہیں۔ پروفیسر صاحبہ کی یہ بات صرف مخصوص صلاحیتوں تک محدود نہیں بلکہ تمام صلاحیتوں پر صادق آتی ہے۔ ماہرین نے نشوونما (Development) اور بالیدگی (Growth) میں بھی فرق ظاہر کر کے انہیں دو الگ الگ اصطلاحات قرار دیا ہے۔ بالیدگی ایک بیرونی عمل ہے جس کی براہ راست پیمائش کی جاسکتی ہے۔ بالیدگی جسمانی ساخت میں تبدیلی کا نام ہے جو بلوغت پر جا کر ختم یا رک جاتی ہے۔ بالیدگی ساخت میں تبدیلی کا عمل ہے۔ اس کے برعکس نشوونما کردار میں تبدیلی کا عمل ہے۔ یہ ایک اندرونی عمل ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ماپا نہیں جاسکتا۔ بالیدگی کے برعکس نشوونما ایک خاصیتی عمل ہے جو تمام عمر جاری رہتا ہے۔ جسمانی ساخت یا بناوٹ کی وجہ سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے جسم کے افعال ووظائف میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ افعال کی یہ تبدیلیاں نشوونما کہلاتی ہیں۔ تاہم بالیدگی اور نشوونما لازم وملزوم بھی ہیں۔ کیونکہ بالیدگی کے بغیر نشوونما نہیں ہوسکتی۔ کچھ بیرونی عوامل جیسے بیماری' پریشانی یا ماحول وغیرہ' بالیدگی کو متاثر کرتے ہیں تو نشوونما کا عمل بھی متاثر ہوتا ہے۔

ذہنی نشوونما یا ذہنی صلاحیتوں کے ارتقاء کے عام وسیلے اکتساب' تربیت وتعلیم وتعلم' سماجی اثرات' اثر پزیری' ارتقاء کے مواقع' مناسب اور سازگار ماحول' ہمت افزائی' مطابقت پزیری اور خاندان وگروہوں کے اثرات ہیں۔ ان میں ہر وسیلہ اہم ہے اور کسی نہ کسی صلاحیت کے ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ ان خارجی وسائل کے علاوہ ذہنی ارتقا کے لئے کچھ داخلی وسیلے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں اثر پزیری' نقل' مشاہدہ وادراک' تجسّس' مستقبل کا تصور یا مستقبل کی سمت' حرکت' مقاصد کی ابتدا اور تخیل وتصور ہوتے ہیں۔

پروفیسر ساجدہ کا کہنا ہے کہ ''عام طور ماہرین نفسیات کا خیال ہے جس کی توثیق میں تحقیقات بھی شامل ہیں کہ ''ذہنی قوت کی مقدار'' (Intelligent qutient) یا 'I.Q' ہے۔ جو پیدائش کے وقت کم وبیش متعین ہوجاتا ہے۔ بلکہ پیدائش یعنی نطفہ کی بارآوری کے وقت سے ہی اس کا تعین ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ذہانت یا ذہنی قوت موروثی ہوتی ہے۔ اکتسابی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسانی ذہن کی ارتقاء ہمہ وقت ہوتی رہتی ہے اور ذہانت میں جو امکانات پوشیدہ ہیں وہ خارجی اور داخلی کے درمیان عمل اور ردِعمل کے سلسلے کے ذریعے نشوونما کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ یعنی انسانی ذہانت تو موروثی ہوتی ہے اور وہبی ہے''۔ ان کے مطابق ذہن کا خارجی دنیا سے اولین رابطہ حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے جن میں سے قوتِ مشاہدہ ارتقائی منازل میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلیتی ہے۔ ''حواس خمسہ'' کے علاوہ ''خارج کا ادراک'' ذہنی ارتقاء کا بہت بنیادی وسیلہ ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ بظاہر مشاہدہ اور ادراک کو معروضی ہی ہونا چاہئے ''لیکن درحقیقت مشاہدہ اور ادراک میں ''معروضی'' سے زیادہ ''موضوعی ذہنی عمل'' کا دخل ہوتا ہے''۔ اپنے اس مؤقف کے حق میں ادراک کے کئی اثرات کو پیش کیا ہے۔ مثلاً منظر اور پس منظر کا تعلق، عمومیت ادراک، شخصی تنظیم کے لئے عمومیتِ ادراک کی اہمیت، انتخاب مدرکات اور مشاہدہ وادراک کے مخصوص انداز، تشویش اور غیر محفوظیت کا ادراک پر اثر اور نقل اور اثر پزیری وغیرہ۔ ان اثرات کی تفصیل کافی طویل ہے۔ مقصد صرف ان کے نقطہ نگاہ کو سامنے لانا تھا۔

ذہانت سے مراد وہ درست ردِعمل ہے جو اپنی عمر کے مطابق کوئی فرد ظاہر کرتا ہے سپیئرمین نے ذہانت کی تعریف میں کہا ''ذہانت سے مراد ایسی اہلیت ہے جس سے آدمی اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے''۔ کول وین کے مطابق ''ذہانت ایک ایسی خصوصیت ہے جو افراد کی نئے ماحول اور حالات کے ساتھ مطابقت کرنے میں مدد دیتی ہے''۔ وڈورتھ کے نزدیک ''ذہانت اہلیت کے درست استعمال کا نام ہے''۔

الفرڈ پینے کی تعریف کو زیادہ جامع سمجھا جاتا ہے۔ ''ذہانت سے مراد وہ اہلیت ہے جس کی بنا پر کوئی شخص اپنی اہلیت کا بروقت درست استعمال کرسکے''۔ ان تعریفوں میں ذہانت اور اہلیت کو لازم وملزوم ٹھہرایا گیا ہے۔ ذہانت ایک پیدائشی وصف ہے لیکن اہلیت کا تعلق آموزش سے ہے۔ یعنی ذہانت کی نشوونما کرکے ہی انسان موقع ومحل کے مطابق مسئلے کا حل تلاش کرکے فوری فیصلہ کرنے کی اہلیت حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لئے جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی نشوونما بھی ضروری ہے۔ ''ذہنی نشوونما سے مراد فہم وبول چال، یاداشت، حالات وواقعات کی تفہیم، مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت، بہتر مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت اور قوتِ استدلال کی خصوصیات کے کامیاب استعمال کرنے کی اہلیت۔ پروفیسر ساجدہ کے مطابق ''اولین نقوش کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں ورثہ میں ملتا ہے وہ نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ منتقل۔ اس کی تکمیل وتشکیل بھی اور تسلسل بھی آئندہ زندگی کے اثرات، رُخ اور نشوونما پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر خداداد ذہانت کو بھی اگر کام میں نہ لایا جائے اور صحیح تعلیم وتربیت سے اس کو جلا نہ ملے تو زنگ خوردہ ہوسکتی ہے یا تخریبی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے''۔ نشوونمایافتہ ذہانت ہی تخلیقی صلاحیتوں اور ذہنی استعداد میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

ذہانت (Intelligence) لاطینی زبان کے لفظ 'Intelligere' سے نکلا ہے جو کہ Inter اور Legere سے بنا ہے۔ ان کے معنیٰ انتخاب کرنا یا سمجھنا ہیں۔ ذہانت کے ان لغوی معنوں سے اس کی نوعیت کے کچھ پہلو سامنے آتے ہیں رفیق جعفر کے نزدیک ان پہلوؤں میں (1) ذہانت' سوچ' فکر' سمجھ بوجھ' عقل یا فہم سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ (2) ذہانت کا تعلق صرف عقل سے نہیں بلکہ ہماری تمام نفسیاتی خصوصیات سے ہے یعنی ذہانت کو فرد کی دوسری خصوصیات مثلاً ادراک یا احساس' محرکات' شخصیت وغیرہ سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ (3) اس تعریف میں کسی انفرادی خصوصیت کی نہیں بلکہ مخصوص عمل (انتخاب کرنا۔ سمجھنا) کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ فرد کے عمل یا کردار کی ایک خصوصیت ہے۔ اسے اسم صفت کی بجائے اسم معرفہ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ یعنی فرد میں ذہانت ہے یا ذہین ہے کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ فرد کسی کام کو عقل مندی سے یا بے وقوفی سے کرتا ہے''۔ انہوں نے کہا ہے کہ ''ذہانت کے بارے میں کئی لوگوں کا یہ غلط تصور ہے کہ یہ خداداد صلاحیت ہے جو وراثت میں ملتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ تجربات بیان کر چکے ہیں جن سے عیاں ہوتا ہے کہ ماحول اور تربیت کے زیر اثر فرد کی ذہانت میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے''۔ محترم رفیق صاحب یہاں تضاد کا شکار نظر آتے ہیں۔ ذہانت کا وراثت میں ملنا الگ بات ہے اور اس کی نشوونما کر کے اس میں اضافہ کرنا الگ بات ہے۔ اس بات سے ہرگز یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خداداد ملکہ نہیں۔ ان کے نزدیک ذہانت کا تعلق دماغ کے سائز سے نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں۔ ''یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ دماغ کے سائز کا ذہنی قابلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً مشہور فلسفی کانٹ اور مشہور فرانسیسی ادیب انیقول فرانس کے دماغوں کا وزن عام افراد کے دماغ کے اوسط وزن سے تقریباً 30 فیصد کم تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی کہاوتوں میں کوئی حقیقت نہیں کہ ''سر وڈے سرداراں دے' پیر وڈے گنواراں دے''۔ ماہرین نے ذہانت کی پیمائش کے مختلف سکیل اور طریقے وضع کئے ہیں۔ بینے (A-Benet) نے افراد کی خصوصیات میں پائی جانے والی تفریق کا باقاعدہ شماریاتی طریقوں سے مطالعہ کیا۔ بینے کے نزدیک اگر ایک چھ سالہ بچے کی ذہنی سطح آٹھ سال ہے تو اس کی ذہانت 2+ ہے یعنی اپنے ہم عمر سے دو سال زیادہ۔ سٹرن نے ذہنی سطح کی جگہ پہلی بار ذہنی عمر کی اصطلاح استعمال کی اور ذہنی اور طبیعی عمر کے رشتے کو اس فارمولے سے ظاہر کیا''۔

$$\text{''قیاس ذہانت'' (I.Q)} = 100x \frac{\text{ذہنی عمر (Mental age)}}{\text{طبیعی عمر (Chronological age)}}$$

یعنی اگر بچے کی طبیعی عمر 6 سال اور ذہنی عمر 5 سال ہے تو 100x5/6=83 قیاس ذہانت (I.Q) ہوگا۔

انسانی شخصیت کی حدود متعین کرنے میں فرد کے کردار اور مزاج کا بھی خاصا دخل ہے۔ پروفیسر ساجدہ کہتی ہیں کہ 19 ویں صدی کے اواخر تک کردار اور شخصیت دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں رائج تھے۔ بلکہ کردار کے بغیر شخصیت کا کوئی خاص تصور بنتا ہی نہیں تھا۔

حالانکہ کردار ایک اخلاقی تصور ہے اس کا تعلق عمل کے اس دائرے سے ہے جو خیر وشر۔ سچ۔ جھوٹ اور اچھے اور برے کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی تعبیر اخلاقیات واقدار کے نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ جو شخص اخلاقی اعتبار سے قابل اعتراض ہوتا ہے جس کا عمل مروجہ یا دائمی اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے اور جس کو سماج اس کے عمل کے اخلاقی پہلو سے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے اس کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کریکٹر یا کردار ''خراب'' ہے۔ یعنی کردار کی کسوٹی اخلاقیات اور خیر وشر کے پیمانے ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحبہ نے مروجہ اور دائمی اقدار کو دو الگ الگ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک مروجہ یا سماجی اقدار زماں ومکاں' مذہب وملت' سماج اور گروہوں کے اعتبار سے مختلف بھی ہوتی ہیں اور بدلتی بھی رہتی ہیں لیکن اس کا دائمی اقدار پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں۔ ''مختصراً یہ کہ کردار شخصیت کا وہ پہلو ہے جس کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اقدار کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے۔ خیر وشر کے مطلق تصورات کے تحت اس کی تعبیر کی جاتی ہے یا اسے پسندیدہ ومذموم کے زمانی ومکانی تصورات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہم بعض معروضی خصوصیات کو کردار کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتے مثلاً جذباتی رجحان' عقلی رجحان' تخلیقی وغیرہ کردار کی خصوصیات نہیں سمجھی جاتیں۔ ہم کسی کے کردار کو جذباتی کردار یا تخلیقی کردار نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان رجحانات کا مفہوم بڑی حد تک معروضی ہے اور اخلاقی اقدار سے بیگانہ ہے۔ مثال کے طور پر نہ جذباتی ہونا کوئی اخلاقی عیب ہے اور نہ ہی عقلیت پسند ہونا بحیثیت خود کوئی خوبی یا برائی ہے۔ یہ شخصیت کے بعض نمایاں رجحانات ہیں اور بس۔ لہٰذا گو کہ خیر وشر کے تصور سے ماوراء ہیں لیکن نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم ہیں''۔ اس کے برعکس شخصیت بڑی حد تک اخلاقی اعتبار سے معروضی حقیقت رکھی ہے۔ یہ اچھی یا بری' کم یا زیادہ' مذموم یا پسندیدہ نہیں ہوتی۔ شخصیت دلچسپ' گہری' سطحی' اکہری' پیچ در پیچ' پرلطف' بیزار کن' صحت منداور مریض تو ہو سکتی ہے۔ لیکن کم یا زیادہ کے یا اچھے اور برے کے ضمن میں نہیں آتی۔ اچھائی' برائی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن نفسیاتی نکتہ نگاہ سے ہر شخصیت بلحاظ وقوعہ کے یکساں ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات مجرموں' منحرفوں' ذہنی مریضوں' منتشر اور مضطرب ہستیوں اور عجیب شخصیت کی عام نارمل شخصیت سے زیادہ اہمیت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے شخصیت کی پیچیدگیوں کو سمجھنا اور اس کے لاشعوری عوامل تک رسائی نسبتاً آسان ہوتی ہے۔

کردار کی طرح 'مزاج' بھی شخصیت کے ہم معنی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ مزاج درحقیقت قدیم ترین علم الحکمت (طب) اور اس سے متعلق نفسیات سے ماخوذ اصطلاح ہے۔ مزاج کے اعتبار سے شخصیت کی تقسیم ایک طرح سے 'Typology' یعنی تقسیم بلحاظ ٹائپ کی ابتدائی اور مستند ترین تقسیم ہے جس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی۔ یونانی حکمت کی رُو سے انسانی مزاج اخلاط (Mixture) کی کیفیت کا عکس ہوتا ہے۔ یعنی انسان کے جسم میں جو چار اخلاط۔ خون' بلغم' صفرا اور سودا ہوتے ہیں وہ اس کے جسمانی مادی وجود میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور متعلقہ مزاجی کیفیات (یا کردار وشخصیت) کے ذریعے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس ٹائپی تقسیم کا منبع درحقیقت یہ خیال ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک کائنات اصغر ہے لہٰذا جن عناصر سے مل کر یہ کائنات بنی ہے ان کی موجودگی انسان کی جسمانی طبیعی ساخت میں بھی ضروری ہے اور ان ہی خصوصیات کے حامل انسان کی ذات میں شامل عناصر اربعہ' ان سے متعلقہ

خصوصیات کی حامل' مزاجی کیفیات ہیں جو شخصیت کے تعین کا طبعی' نفسی منبع ہیں۔ ان ہی عناصر کا اظہار اس کی نفسیاتی خصوصیات میں بھی ہوتا ہے۔ یہ چار بنیادی اخلاط جو کائنات میں موجود ہیں یعنی مٹی' ہوا' آگ اور پانی' انسانی ذات میں خون' سودا' صفرا اور بلغم ہیں اور وہی انسانی شخصیت میں چار بنیادی کیفیتیں ہیں۔ جن کو چار مزاجی کیفیتیں کہا جاتا ہے۔ ماہرین نے ان چار مزاجوں کی علیحدہ علیحدہ کیفیات اور خصوصیات کی وضاحت کی ہے جو بہت لمبی ہے یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا جائے گا۔ (1) دموی (Sangune) مزاج کا تعلق خون سے ہے۔ اس مزاج کی حامل شخصیت ایک طرف گہری اور تنگ ہوگی تو دوسری طرف جوشیلی اور ہنس مکھ ہوگی نیز پھرتیلی اور کمزور بھی ہوگی۔ (2) سوداوی (Meloncholic) مزاج کا تعلق سودا (جنون) سے ہے۔ اس کے مزاج میں وحشت' سودا اور خفقان کا مادہ ہوتا ہے۔ ایسے مزاج کو مالیخولیائی مزاج بھی کہتے ہیں وہ اکثر اداس' ملول اور دلگیر رہتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک قسم کی غمنا کی' مایوسی اور اکثر اوقات قنوطیت کے رجحانات نمایاں ہوتے ہیں۔ (3) صفراوی (Choleric) مزاج میں چونکہ صفرا یا زرد آب کی زیادتی ہوتی ہے اس لئے اس کی طبیعت میں تند مزاجی کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیت میں اگر ایک طرف چڑچڑاپن' غصہ' خفگی' تنک مزاجی اور تیزی وتندی ہوگی تو دوسری طرف وہ ارادہ وعمل کی مضبوطی' تیزی و پھرتیلا پن' وسعت اور گہرائی جیسی خصوصیات کی حامل ہوگی۔ (4) بلغمی (Phlegmatic) مزاج کے وہ اشخاص ہوتے ہیں جن کا مزاج عموماً کاہل' ٹھس اور کردار کے لحاظ سے عموماً کمزور ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج میں گہرائی نہیں بلکہ ایک قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ البتہ سکون' خوش طبعی اور دوستی کے حامل ہوتے ہیں۔ مزاج کے بارے میں ماہرین نفسیات کے یہ اندازے ہیں۔

انسان اپنی روزمرہ کی گفتگو میں اکثر لفظ توجہ (Attention) کا استعمال بھی کرتا ہے اور سنتا بھی ہے۔ آیئے ذرا جائزہ لیں کہ توجہ دراصل ہے کیا؟ اس کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے۔ ''توجہ سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے احاطہ شعور میں موجود بہت سی اشیاء میں سے کسی ایک چیز پر شعور کو مرکوز کیا جاتا ہے۔ اور دیگر اشیاء کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے''۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ توجہ ایک انتخابی عمل ہے جس میں انسان اپنے احاطہ شعور میں موجود بہت سی اشیاء میں سے اپنی دلچسپی یا ضرورت کے تحت کوئی چیز چنتا ہے اور اسے اپنے شعور کا مرکز بناتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے آس پاس اور آپ کے جسم میں ہر وقت بہت سے اعمال اور واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں آپ کے کئی حواس بیک وقت متاثر ہوتے ہیں اور دماغ کو معلومات پہنچاتے ہیں۔ یوں ایک ہی وقت میں آپ بہت سی چیزوں کا احاطہ کرتے رہتے ہیں۔ جب آپ اپنے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب کو پڑھنے میں مشغول ہوتے ہیں تو بھی آپ باہر سے بولنے والے افراد کی باتیں' پرندوں کی آوازیں' ٹریفک کا شور' سبزی بیچنے والے کی آواز سن رہے ہوتے ہیں۔ آپ کے دماغ میں کئی خیالات بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ کئی یادیں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ چائے کی چسکی بھی لے رہے ہوتے ہیں آئندہ کے لئے منصوبے بھی بن رہے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تمام باتیں آپ کے شعور میں یکساں طور پر صحیح نہیں ہوتیں۔ آپ کا زیادہ تر دھیان پڑھنے پر ہوتا ہے۔ اور دیگر تمام اشیاء کو آپ نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ آپ صرف پڑھائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی توجہ ہے۔

توجہ کی حالت میں ہم نہ صرف اپنے شعور کو کسی خاص چیز پر مرتکز کرتے ہیں بلکہ ہمارے جسم کے اندر عصبی نظام میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ اعضائے حواس بھی خاص انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ عموماً ہم اپنی دلچسپی یا ضرورت کی بنا پر کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر بعض چیزوں میں کچھ ایسی خصوصیات یا کشش ہوتی ہے کہ ہماری توجہ خود بخود ان کی طرف چلی جاتی ہے۔ معروضی عوامل میں مہیجات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حرکت، رنگ، نرالا پن، شدت اور جسامت وغیرہ۔ جبکہ موضوعی عوامل کا تعلق توجہ دینے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔ اس میں فرد کی اپنی دلچسپی، ضرورت، ذہنی وجسمانی کیفیت، تجسّس، کامیابی کی تمنا، عزت ووقار کی خواہش، جنس مخالف میں دلچسپی، پیار، تحفظ اور تفریح وغیرہ شامل ہیں۔

انسانی بچے اور حیوانی بچے میں پیدائش کے وقت سے ہی ایک اہم اور بنیادی فرق نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ اور وہ فرق ہے آموزش یا تعلم (Learning) کا۔ حیوانی بچے کو پیدائش سے ہی اپنے نفع ونقصان اور زندگی گزارنے کا علم ہوتا ہے۔ اسے یہ علم سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مرغی کا بچہ پانی کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر اس سے دُور بھاگے گا جبکہ بطخ کا بچہ اسے زندگی کا وسیلہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف لپک کر جائے گا۔ اس کے برعکس انسانی بچے کو کسی قسم کا علم نہیں ہوتا وہ پانی کو بے ضرر ''سمجھ'' کر حوض میں بھی کود سکتا ہے اور آگ کے انگاروں کو پھول ''جان'' کر ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی بچے کو ہر چیز کا علم سیکھنا پڑتا ہے۔ ماہر نفسیات عبدالحمید نے اس صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ چڑیا کا بچہ جب انڈے سے باہر آتا ہے تو پیدائشی طور پر ایک پروگرام کے تحت اس کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ نشوونما کے مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے اس کی زندگی کم و بیش ایک ہی طریقے سے گذرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا زیادہ تر کردار جبلی ہوتا ہے۔ اسی طرح مکڑی بغیر سیکھے ہوئے پیچیدہ اور مخصوص قسم کا جالا بننا جانتی ہے۔ لیکن انسانوں کا معاملہ جانوروں سے مختلف ہے۔ پیدائش کے وقت بچے میں اگرچہ کچھ پیدائشی میلانات اور رجحانات ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی نوعیت اور سمت جانوروں کی مانند حتمی نہیں ہوتی اور ان کی مناسب نشوونما کے لئے سازگار ماحول اور تعلیم وتربیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یوں سیکھنے کا عمل پیدائش کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ اور زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں بچوں کی تعلیم وتربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ روزمرہ کے سادہ کاموں جیسے کھانا کھانا، ہاتھ منہ دھونا، کپڑے پہننا وغیرہ سے لے کر پیچیدہ قسم کے معاشرتی، سائنسی، معاشی روّیے اور خیالات سبھی سیکھے جاتے ہیں۔ ان تمام امور کا انحصار کسی طے شدہ پیدائشی نظام پر نہیں بلکہ بیرونی حالات، گردوپیش کے ماحول اور حاصل ہونے والے مواقع پر ہوتا ہے۔

انسانی بچے اور حیوانی بچے کے فرق کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ وہ یوں کہ اگر آپ کتے کے پلے کو جرمنی لے جائیں وہاں اس کی پرورش کر کے بڑا کریں تو بھی اس کی حالت وکیفیت وہی ہوگی جو پاکستان میں کتوں کی ہے۔ ان کی اندرونی حالت ایک جیسی ہوگی۔ البتہ بیرونی طور پر خوراک وسہولیات میں فرق ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں پیدا ہونے والے بچے کو اگر ایک فرانسیسی خاتون گود لے لے اور فرانس لے جائے تو یہ بچہ فرانسیسی زبان سیکھے گا۔ اس کی عادتیں، روّیے حتیٰ کہ خیالات بھی فرانسیسوں جیسے

ہوں گے۔ یہ حقائق یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگ مختلف کرداروں اور خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں انسان کی کرداری خصوصیات کو پیدائشی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے برعکس انسان تمام کرداری نمونے اپنے معاشرتی ماحول سے سیکھتا ہے۔ فرد کو ملنے والا ماحول اور آموزش کے مواقع ہی طے کرتے ہیں کہ فرد آئندہ کیا بنے گا۔ آپ مخصوص زبان بولتے ہیں، خاص قسم کے کھانے پسند کرتے ہیں، شرمیلے، بے تکلف، نڈر یا بزدل ہیں، مخصوص رویے اور خیالات رکھتے ہیں، یہ سب اس لئے کہ آپ کو یہی سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ آپ کی نشوونما اور تعلیم وتربیت کسی اور معاشرے میں ہوتی تو آپ ایک مختلف انسان ہوتے۔ گویا سیکھنا ایک بنیادی انسانی خصوصیت ہے۔ انگریز مفکر اور فلسفی جان لاک نے درست ہی کہا تھا کہ پیدائش کے وقت بچے کا ذہن ایک صاف تختی کی مانند ہوتا ہے جس پر روزمرہ تجربات اور آموزش کے ذریعے اثرات منقش ہوتے ہیں۔

فرد کی پوری زندگی تبدیلی سے عبارت ہے۔ اس تبدیلی کے پیچھے بہت سے عوامل کارفرما ہیں۔ ان میں اہم ترین عنصر آموزش کا ہے۔ آموزش کا لفظی مطلب سیکھنا ہے۔ فرد زندگی کے ہر مرحلے پر بے شمار نئی باتیں سیکھتا ہے۔ روزمرہ کے عام امور سے لے کر نفسیات پڑھنے تک ہر چیز آموزش ہے۔ آموزش سے مراد تجربات کے نتیجے میں کردار میں پیدا ہونے والی تبدیلی ہے۔ بچہ چند صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے مگر رویے، دلچسپیاں، مہارتیں وغیرہ وہ آموزش یا تعلم (Learning) کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ ماہرین نفسیات ملک محمد موسیٰ اور شازیہ رشید کے مطابق ''بچہ قدرتی طور پر بول چال، احساسات، سوچ بچار اور دلچسپیوں کے کوئی خاص نمونے لے کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ تمام وہ (آموزش) اور ماحول سے سیکھتا ہے۔ پیدائش کے وقت بچے کو اپنے معاشرے کے پسندیدہ کرداری نمونوں کا شعور نہیں ہوتا بلکہ بعد میں وہ ماحول کے مطابق سیکھتا ہے۔ بچوں میں مختلف ثقافتی اختلافات مثلاً زبان، طرز بود وباش، لباس وغیرہ ماحول ہی کی دین ہیں۔ نامناسب ماحول میں بچے اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال نہیں کر سکتے۔ ماحول بچے کی اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے''۔ (جاری ہے)

☆.....☆.....☆

اِک چراغ اور بُجھا اور بڑھی تاریکی

گذشتہ دنوں اطلاع ملی کہ پشاور میں محترم صابر صدیقی بھی اِس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم تادمِ آخر تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ قرآنِ کریم، اقبال اور تاریخ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ ابلہِ مسجد، اقبال۔ دشمنِ دنیا ودین، اور بایزید بلدرم جیسی کتب تحریر فرمائیں جو طبع ہو کر مقبول قرار پائیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل۔ ادارہ مرحوم کے لواحقین، اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط ہفتم

پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت

اطیعوالرّسول:۔ اتباعِ سنّت کے معاملے میں قرآن کریم کا حکم ''اطیعواللہ واطیعوالرّسول'' پیش کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس کا بھی صحیح مفہوم نہیں لے رکھا۔ اور یہ نتیجہ ہے دین اور دنیا کے الگ الگ ہو جانے (سیکولرزم کے فروغ) کا۔ جب خلافت ،ملوکیت میں اور دین ، مذہب میں تبدیل ہو گئے تو مذہبی پیشوائیت کا وجود ملوکیت اور مذہب (سیکولرزم) کی بقا کے لئے لازمی قرار پایا۔ مذہبی پیشوائیت نے دین کو دنیا سے الگ کر کے سیکولرزم کی بنیاد ڈالی اور اسے فروغ دیا کہ دنیاوی (سیاسی) امور، حکومت (بادشاہت وغیرہ) نپٹائے گی لہٰذا پبلک لاز حکومت ہی کی طرف سے نافذ کئے جائیں گے جبکہ مذہبی امور (پرسنل لاز) اُمت کے علیحدہ علیحدہ فرقوں (جو کہ دین سے دنیا کی علیحدگی۔ خلافت کی ملوکیت۔ اور۔ دین کی مذہب میں تبدیلی۔ یعنی سیکولرزم۔ کے وجود میں آجانے کے ساتھ ہی وجود میں آگئے تھے) کے مذہبی پیشواؤں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ اب دین ایک اجتماعی نظام کی بجائے، انفرادی معاملہ قرار پا گیا۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ''اطیعواللہ واطیعوالرسول'' کے قرآنی حکم پر انفرادی طور پر، الگ الگ کس طرح عمل ہوگا؟۔ مذہبی پیشوائیت کی عقلِ حیلہ جو نے ''اطیعواللہ'' سے مراد قرآنِ کریم اور ''اطیعوالرسول'' سے مراد احادیث وسنّت کی اتباع میں چلنا، لے کر ''مسئلہ حل کر دیا''۔ اس طرح اُن کا ''دین سے دنیا کو علیحدہ'' رہنے دینے کا مقصد پورا ہو گیا اور ''اللہ ورسول'' کی اصطلاح کا مفہوم ''سیاسی'' نہ رہا (مؤلف)۔

اللہ ورسول سے مراد:۔ ''اطیعواللہ واطیعوالرّسول'' کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ جن قرآنی آیات میں ''اللہ ورسول'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے مراد ''مرکزِ اسلام'' یعنی ''اسلامی حکومت'' ہے۔ یہ ''مرکزِ اسلام'' پہلے پہل حضور کریم ﷺ نے خود قائم فرمایا تھا۔ حضور کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہ نقشہ قائم رہا جسے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں ''خدا اور رسول کی اطاعت'' الگ الگ، اپنے اپنے طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ''مرکزِ ملّت'' (خلافت) کی طرف سے جو احکامات وہدایات نافذ ہوتی تھیں ان پر عمل کرنے کا نام ''اطاعتِ اللہ ورسول'' تھا۔ اس تمام دوران میں قرآنِ کریم کے علاوہ مملکتِ اسلامی کا کوئی اور ضابطہء نظریہ وعمل نہیں تھا۔ یہ امامتِ کبریٰ، جو آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی

کے ذریعے سے بنی نوعِ انسان کی ہدایت، راہنمائی اور اصلاح وفلاح کے لئے قائم ہوئی، قیامت تک مستمر ہے (جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے ہمیشہ قائم رہنی چاہیئے)۔

☆.....☆.....☆

''مرکزِ ملّت'' کا تصور، اگرچہ اسلام کے سیاسی نظریہ سے تعلق رکھتا ہے ہے اور اسے پرویز صاحب کے ''نظریہء اسلامی حکومت'' کے تحت پیش کیا جانا چاہیئے لیکن چونکہ یہاں اطیعواللہ واطیعوالرسول کے مروجہ مفہوم (اللہ کی اطاعت بذریعہ قرآن اور رسول کی اطاعت بذریعہ احادیث) کی بجائے اس کا قرآنی مفہوم پیش کیا جارہا ہے لہٰذا، اسے یہاں پیش کیا جانا مناسب ہے۔ اسے نظریہء'' اسلامی حکومت'' کے ساتھ ملا کر بھی پڑھا جانا چاہیئے (مئولف)۔

مرکزِ ملّت:۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۰ء۔ص۔۱۵:۔ پرویز صاحب قرآنی منشور کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نظم ونسقِ حکومت کے لئے ایک مرکزی کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بحیثیتِ مجموعی تمام امور کی نگرانی کرے۔ چونکہ قرآنی مملکت سب سے پہلے نبیءاکرم نے قائم فرمائی تھی، اس لئے اس مملکت کا مرکزی کنٹرول (جسے آج کی اصطلاح میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت کہا جاتا ہے) رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ حضور ﷺ کا یہی وہ فریضہ یا منصب تھا جس کے متعلق قرآن کریم میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ:۔ **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا** (2:143)۔ ''اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال وامور کی نگرانی کرتے رہو۔ اور تمہارے اعمال وامور کی نگرانی رسول ﷺ کرے۔'' اس مرکز کے مقرر کردہ افسرانِ ماتحت ہوں گے لیکن ان کے اختیارات، مرکز کے تفویض کردہ اور محدود ہوں گے۔ تمام اختلافی امور، مرکز کی طرف (Refer) کئے جائیں گے۔ اور مرکز کا فیصلہ آخری ہوگا (۴/۵۹)۔

کسی کو استثنیٰ حاصل نہیں ہوگی:۔ اور چونکہ تمام مسلمانوں نے (جن میں یہ افسرانِ ماتحت بھی شامل ہوں گے) اس قرآنی نظام کو بطیبِ خاطر اختیار کیا ہوگا، اس لئے اس کے مرکز کے فیصلوں کو بطیبِ خاطر مانا جائے گا۔ ان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہیں ہونے دی جائے گی (۴/۶۵)۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ مرکزی کنٹرول ہوگا وہ تمام احکام وقوانین کی اطاعت خود بھی اسی طرح کریں گے جس طرح دیگر افرادِ امت۔ اس باب میں انہیں کوئی امتیازی خصوصیت حاصل نہیں ہوگی۔ وہ اعلان کریں گے کہ:۔ انا اوّل المسلمین (۶/۱۶۴)۔ ''ان قوانین کے سامنے جھکنے والوں میں میرا نام سرِفہرست ہے۔'' قانون کی خلاف ورزی کی انہیں بھی وہی سزا ملے گی جیسی دوسرے افرادِ مملکت کو۔ اس باب میں خود نبیءاکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ:۔ ''ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی ڈر ہے کہ اس کی پاداش میں گرفتار ہو

جاؤں گا۔'' (۶/۱۵)۔ اگر اس کے اعزہ واقرباء میں سے کوئی قانون شکنی کرے گا تو اسے (عام افراد کے مقابلہ میں) دُگنی سزا ملے گی (۳۳/۳۰)۔ نبی اکرم ﷺ تو امت کے منتخب کردہ امیر نہیں تھے اس لئے حضور ﷺ کے منصبِ امارت سے الگ ہونے یا کر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا تھا لیکن حضور ﷺ کے بعد، یہ منصب، امت کے منتخب کردہ افراد کے سپرد ہوگا۔ اگر ان میں سے کوئی، قرآنی دستور کی خلاف ورزی کرے گا تو جس مشینری نے اسے منتخب کیا تھا وہی اسے برطرف بھی کر سکے گی۔ اس لئے کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ:۔ ''تو اس کی اطاعت مت کر جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو جائے اور وہ اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور اس کا معاملہ حد سے گزر جائے۔'' (۱۸/۲۸)۔

اطاعتِ مرکزِ ملّت:۔ قرآن کریم میں جو احکام رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے ہیں وہ آپ کی ذات ﷺ اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ''منصبِ امامت'' کے لئے ہیں جس میں آپ ﷺ کے خلفاءؓ بھی (بذریعہ ادارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ) شامل ہیں۔۔۔ پرویز صاحب نے ''شاہکارِ رسالت'' میں اس کی وضاحت کی ہے کہ ''یہ نظام رسول اللہ ﷺ کی ذات اور حضور ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں تھا، اسے اسی طرح آگے چلنا تھا، اس فرق کے ساتھ کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس مملکت کی سربراہی خود رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد اسے آپ ﷺ کے جانشین (خلیفۃ الرّسول) کی طرف منتقل ہو جانا تھا۔ اب ''اللہ و رسول'' کی اطاعت سے مراد، خلیفۃ الرّسول کے فیصلوں کی اطاعت تھی اور اسی طرح اس سلسلہ کو آگے بڑھتے چلے جانا تھا''۔

پرویز صاحب ''معراجِ انسانیت'' میں رقمطراز ہیں۔ ''چونکہ نظامِ دین میں اللہ کے احکام، حکومتِ خداوندی کی طرف سے نافذ ہوتے تھے اور اُس حکومت کے احکام کی یہ مرکزی قوّتِ نافذہ رسول ﷺ کی محسوس شخصیت تھی، اس لئے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیا گیا (اور جو رسول کی اطاعت کرے گا، اُس نے اللہ کی اطاعت کی: ۴/۸۰)۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی اطاعت جو رسول ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔ اور جس کی مرکزی اتھارٹی سب سے پہلے خود رسول ﷺ ہے۔ اسلامی نظام میں یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ، مطاعوں کی اطاعت متصور نہیں۔ اس لئے کہ، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہوسکتی ہے۔ (۱۲/۴۰۔ ۱۸/۲۶۔ ۷۲/۲۰۔ ۱۶/۳۶ وغیرہ)۔ حتیٰ کہ خود رسول ﷺ کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا کہ اُسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے (۳/۷۹)۔ ''(اگر اللہ و رسول کی اطاعت سے مروّجہ مفہوم لیا جائے تو آیات نمبر ۴/۸۰۔ ۱۲/۴۰ وغیرہ اور آیت نمبر ۳/۷۹ میں تضاد واقع ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ پھر اطاعتِ رسول کا قرآنی حکم چہ معنی دارد؟۔ جبکہ قرآن میں تضاد نہیں: ۱/۱۸۔ ۸۲/۴۔ مؤلف)۔ لہٰذا ''اللہ و رسول'' سے مراد وہ مرکزِ نظامِ اسلامی (Central Authority) ہے، جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔

اللہ ورسول یعنی مرکزِ نظامِ اسلامی:۔ یہ حقیقت کہ ''اللہ ورسول'' سے ''مرکزِ ملّت'' مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح وبسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو غور سے دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی''۔ مثلاً: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ (8:20)۔ ''اے مومنو! اطاعت کرو ''اللہ اور اس کے رسول'' کی اور اُس سے منہ نہ موڑو جس حال میں کہ تم سن رہے ہو۔'' اس آیت میں (عنہ) کی ضمیر مفرد ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ''اللہ و رسول'' دونوں سے ایک ہی شے مراد ہے۔ یعنی مرکز۔ ورنہ قاعدہ کے مطابق یہاں ''عنھما'' (جمع) ہونا چاہیئے تھا۔ اور ''جس حال میں کہ تم سن رہے ہو'' کی قید سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہ ہے۔ اور عربی میں اطاعت کے معنی ہی ہیں ''زندہ کی فرماں برداری''۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (8:24)۔ ''اے مومنو! بات مانو ''اللہ ورسول'' کی، جب وہ تم کو ایسے کام کے لئے ''بلائے'' جس میں تمہاری زندگی ہو۔'' یہاں بھی ''دَعا'' کا صیغہ مفرد ہی ''اللہ ورسول'' دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے (کام کے لئے ''بلائیں'' کی جگہ ''بلائے'' ہے)۔ یہ حکم بھی صرف حضور کریم ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ جو آپ ﷺ کے تمام آنے والے خلفاء تک پھیلا ہوا ہے۔ جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضور ﷺ تنہا رہ گئے تو آپ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرم ﷺ نے دی تھی، لیکن چونکہ یہ بلاوا حضور ﷺ کا ذاتی بلاوا نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ نے بہ حیثیت مرکزِ ملّت یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو ''خدا اور رسول'' کی آواز قرار دیا گیا۔ ''جنہوں نے جواب دیا ''اللہ ورسول'' کی پکار کا۔ باوجودیکہ وہ زخم کھا چکے تھے'' (۳/۱۷۲)۔ یہودیوں نے اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے استوار کیا تھا، اس عہد شکنی کو ''خدا اور رسول'' کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا۔ اس لئے کہ یہ مخالفت، نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی۔ ''یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کی مخالفت کی ہے۔ اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ کا قانونِ (پاداشِ عمل) سخت سزا دینے والا ہے۔'' (۵۹/۴)۔ اسی طرح حج اکبر کے دن، جو کہ اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے بعد، سب سے پہلا اجتماعِ عظیم مکّہ میں ہوا، اس میں اس حکومت کی طرف سے کچھ عام اعلانات کئے گئے جن میں بتایا گیا کہ اس حکومت کی پالیسی اور امورِ خارجہ میں مسلک کیا ہوگا۔ اس ضمن میں سب سے پہلا اعلان، مشرکوں سے براءت کا تھا، جو مرکزِ اسلام کی طرف سے ہوا اور وہ ''اللہ ورسول'' دونوں کے نام سے ہوا (۷۔۳۔۹/۱)۔ باغیوں اور ڈاکوؤں کو، جو مرکزِ اسلام کے مجرم ہیں ''اللہ و رسول'' دونوں کے خلاف جنگ کرنے، اور فساد برپا کرنے والے قرار دیا گیا۔ ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں۔۔۔۔ الخ'' (۵/۳۳)۔ ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لئے ہے۔ یہ سزا کچھ عہدِ رسالت ﷺ ہی تک محدود نہیں تھی۔ اور پھر یہ آیت کہ۔ ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسول ہی غالب رہیں گے، بلاشبہ اللہ قوت اور غلبے والا ہے۔'' (۵۸/۲۱)۔ ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلط اسلامی حکومت ہی کا تمکن اور تسلّط تھا۔ ورنہ اللہ تو ہر جگہ

غالب ہے۔ لہٰذا ''اللہ ورسول کے غلبہ'' سے مراد اسلامی نظام ہی کے غلبے سے ہے۔ جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ظاہر ہے کہ اس حکومت کی جو آمدنی ہوتی تھی، وہ مملکت کی آمدنی تھی، اسے بھی قرآن کریم نے ''خدا اور رسول کی دولت'' کہہ کر پکارا ہے (۸/۱)۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں کہا کہ اس کا خمس (پانچواں حصہ) ''اللہ ورسول'' کے لئے الگ کرلو (۸/۴۱)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ یہ پانچواں حصہ امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے صرف کیا جائے گا۔ الغرض بیسیوں آیات ایسی ہیں جن میں ''اللہ ورسول'' کے الفاظ ''مرکزِ نظامِ اسلامی'' کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے اللہ کے دین کے تمکّن کی صورت میں مرکز کی اطاعت ''اللہ ورسول'' کی اطاعت ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم:۔ پرویز صاحب ''معراجِ انسانیت'' میں لکھتے ہیں کہ ''اب سورہ نساء کی اس آیت کی طرف آیئے جس میں یہ نظام وضاحت سے بیان ہوا ہے (اور جس کے غلط مفہوم نے بدقسمتی سے ملّت کو بہت سے مغالطوں میں الجھا رکھا ہے) اس آیت (نمبر ۴/۵۹) کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ:۔ ''اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے صاحبِ حکم واختیار ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو، (یعنی اختلاف ونزاع پیدا ہوجائے) تو چاہیئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو (اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اسے تسلیم کرلو)۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان (یقین) رکھتے ہو (تو تمہارے لئے راہِ عمل یہی ہے)۔ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجامِ کار کی خوبی ہے۔ (کیونکہ اختلاف اور نزاع کے ابھرنے کا موقع نہیں رہتا، اور فتنوں اور فسادوں کا دروازہ بند ہوجاتا ہے)۔'' پرویز صاحب ''معراجِ انسانیت'' میں مزید لکھتے ہیں کہ ''اس آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے، اسے چند سطور آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ لیکن جو مفہوم ہمارے ہاں عام طور پر لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ: (۱):۔ اللہ کی اطاعت سے مراد ہے، قرآن کی اطاعت (۲):۔ رسول کی اطاعت سے مراد ہے، احادیث کی اطاعت، اور (۳):۔ اولی الامر کی اطاعت سے مراد ہے، حکومت کی اطاعت۔ (یعنی تینوں کی الگ الگ اطاعت)۔ اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر تمہیں کسی معاملے میں حکومت سے اختلاف ہو تو اسے دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی رو سے حکومت کے ساتھ مناظرہ کیا جائے، اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہوجائے۔ اس مفہوم کی رو سے، غور کیجئے کہ (علاوہ دیگر امور) دنیا میں کوئی نظامِ حکومت اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے؟۔ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اُس کی مخالفت میں کھڑا ہوجائے اور قرآن و احادیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔ اس آیتِ مقدّسہ کا مفہوم واضح ہے۔ اس میں ''اللہ اور رسول'' سے مراد مرکزِ ملّت یعنی نظامِ خداوندی کی (Central Authority)، اور اولوالامر سے مفہوم ہیں افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملے میں اختلاف ہوجائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کردو، امرِ متنازعہ فیہ کو مرکزی

حکومت کے سامنے پیش کردو (اسے مرکزی حکومت کی طرف Refer کردو)۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف مرکزی عدالتِ عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔ یہ کہ اولی الامر سے مراد مقامی حکّام ہیں۔ اسی سورۃ کی ایک دوسری آیت (۴/۸۳) سے واضح ہے جس میں کہا گیا ہے۔ ''اور جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے، تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی بجائے) اللہ کے رسول کے سامنے، اور اُن لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحب حکم و اختیار ہیں، پیش کرتے، تو جو بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی)۔'' یعنی اگر اس قسم کا واقعہ مدینہ میں ظہور پذیر ہوتو اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دی جائے۔ اور اگر کہیں باہر ہوتو مقامی حکّام کو اس سے مطلع کیا جائے۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ:۔ اس سلسلے میں ایک باریک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ پرویز صاحب ہر مرکز کو قابلِ اطاعت قرار نہیں دیتے۔ وہ صرف اُس مرکزِ ملّت کی اطاعت کو جائز قرار دیتے ہیں جو قرآن کے مطابق قائم ہو۔ وہ ''معراجِ انسانیت'' میں وضاحت کرتے ہیں۔ ''ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظامِ قرآنی میں اطاعت، مرکزِ ملّت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کرتا ہے، اور سب سے پہلا مرکز رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی اس لئے قرآن کریم میں مرکزِ ملّت کو ''اللہ و رسول'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یاد رکھیئے! مرکزِ ملّت سے مراد مسلمانوں کی ہر حکومت کا سربراہ نہیں۔ اس سے مراد اُس حکومت کا سربراہ یا مرکزی اتھارٹی ہے جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اس حکومت کو سب سے پہلے خود نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور وہی اس کے اوّلیں سربراہ تھے۔'' محترم قارئینِ کرام کی مزید معلومات کے لئے عرض ہے کہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ اور پرویز صاحب سے بہت پہلے امام ابن جریر طبریؒ نے سورہ انفال کی پہلی آیت کی تفسیر میں ''اللہ و رسول'' کا مطلب ''امامِ وقت'' لیا ہے۔ امام رازیؒ نے آیت نمبر ۵/۳۳ کے تحت امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے جس میں ''اللہ و رسول'' سے مراد ''امام'' لیا گیا ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ''الدر المنثور'' میں ''امام'' ہی مراد لیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے ''فتح البیان'' میں اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ''اللہ و رسول'' سے مراد ''امامِ وقت'' ہی لیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بھی تفہیم القرآن میں آیت نمبر ۵/۳۳ کی تفسیر میں ''اللہ و رسول'' کا یہی مفہوم بیان کیا ہے کہ ''خدا اور رسول'' سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے قائم کر رکھا ہو۔''

مرکزِ ملّت کا تصور:۔ پرویز صاحب کے بارے میں جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ انہوں نے پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کو ''مرکزِ ملّت قرار دے کر ان کی اطاعت کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔'' حالانکہ پرویز صاحب شروع ہی سے اسلامی حکومت کی ایک مرکزی اتھارٹی (جو قرآن کے احکامات کے مطابق قائم ہو اور قرآن ہی کے قوانین و احکامات کو نافذ کرنے کی پابند ہو) کے

بارے میں لکھتے چلے آرہے تھے۔وہ یہ کچھ ملک غلام محمد وغیرہ کے برسرِ اقتدار آنے سے بہت پہلے (۱۹۴۸۔۱۹۳۸ء میں) لکھ چکے تھے۔اس اسلامی سیاسی تصور کے بارے میں مزید وضاحت طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۷۸ء۔ص۔۳۴۔پر ملاحظہ فرمائیں۔:۔''نبی ءاکرم ﷺ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضور ﷺ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے۔اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔حضور ﷺ کی یہ حیثیت منفرد تھی۔جس میں نہ اُس وقت کوئی اور شریک ہوسکتا تھا، نہ اس کے بعد۔اس لئے کہ حضور ﷺ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔حضور ﷺ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

(۲)۔حضور ﷺ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً نافذ کیا جائے۔اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔اس مرحلہ میں حضور ﷺ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہوگیا تھا۔اس میں حضور ﷺ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق، اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (state) اور اس اتھارٹی کو (Head of the state) کہا جاتا ہے۔اِن ہر دو مراحل میں، حضور ﷺ کی اطاعت جماعتِ مومنین پر فرض تھی۔

(۳)۔حضور ﷺ کی وفات کے بعد، وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔اب، مرکزِ ملّت، حضور ﷺ کا جانشین، خلیفۃ الرسول، یا امیر المومنین تھا۔اور امت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

(۴)۔اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالت مآب ﷺ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا۔اور خلافت، ''سلطنت'' میں تبدیل ہوگئی جس میں احکامِ خداوندی کی بجائے، سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا تھا اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اُسی قسم کی تھی جس قسم کی دنیا کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ان سلاطین کو ''مرکزِ ملّت'' کہنا ہی غلط ہے۔''مرکزِ ملّت'' صرف اُسی نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرے، اور امورِ مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔جو نظام، خدا کی عائد کردہ حلال وحرام کی قیود کو توڑے اور اوامر ونواہی کی پرواہ نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔اسے خدا اور اس کے رسول ﷺ سے کیا تعلق؟۔اس کی اطاعت، طاغوت کی اطاعت ہے۔یہ طلوعِ اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام (مثلاً) غلام محمد مرحوم یا سکندر مرزا کو مرکزِ ملّت اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ھذا افک ''عظیم''۔طلوعِ اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔اس نے مرکزِ ملّت کی تشریح ہمیشہ ''خلافت علیٰ منہاجِ رسالت'' کے الفاظ

سے کی ہے۔ یعنی اس قسم کا نظام جو۔ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ۔ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا۔ جس میں مملکت کا تمام کاروبار، قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورہ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورۃ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 5657)	384	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ع ب د

عبد ۔ دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس کے کھانے سے اونٹ فربہ ہو جاتے ہیں اور ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھاتے ہیں تو وہ پیاسے ہو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں۔ (۱) کشش و جاذبیت۔ (۲) ابتداءً پیاس کی تکلیف لیکن آخرالامر (۳) فربہی اور دودھ کی فراوانی۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداءً تکلیف لیکن آخرالامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں۔ اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تارکول ملتے تھے تو اس سے کشتی بدصورت ہو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے ایسی کشتی کو سفینة معبدة کہتے تھے (تاج)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے۔ یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت۔ (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آتی جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عبادة کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سرانجام دیا جائے (کیونکہ عبد پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش ہو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی انسان، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے پہلے کہا کہ وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (51:55)۔ ان کے سامنے خدا کا ضابطۂ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:54)۔ ان سے کہہ دے کہ ہم نے تمام انسانوں کو، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی (جن و انس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)، اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداءً مشقت اٹھانی پڑے گی (اس لئے کہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں۔ بالکل نہیں۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (51:57)۔ ہم ان سے رزق نہیں چاہتے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائیں اور ہم کھائیں۔ ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ہے (تنفع المؤمنین)۔ آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کریں گے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑے گا اور یہ گراں گذرے گا۔ لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی۔

''مشقت اور منفعت'' کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عبد کے معنی سمجھئے۔ تعبید کے معنی ہیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا (لین وتاج) (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ہیں۔ یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو۔ اسی طرح سڑک کو کوٹ کر ہموار کر دینا تا کہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں، یہی تعبید کہلاتا ہے (لین وتاج)۔ آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداءً کس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے۔

لہٰذا عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (16:36) سے اس مفہوم کو واضح کر دیا۔ طاغوت (اس کے معنی (ط۔غ۔ی) کے تحت دیکھئے) کے معنی ہیں سرکش قوتیں۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے، یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو۔ دوسری جگہ ہے لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (19:44)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو (اس کے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو۔ دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا۔ عراق میں (موصل کے قریب) ایک باطنی فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (''ملک طاؤس'' کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ہیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔) ''شیطان'' کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (19:44) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش۔ط۔ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا؟۔ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (16:36) یوں ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ یعنی خدا کی طرف سے جو

رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ ''اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو''۔ اس تقابل سے ''اللہ کی عبودیت'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتب سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (4:60)۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں' حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۲/۲۵۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات و خیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے' بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے۔ اسی کو اعبدوا اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کریم نے ''خدا کی عبادت'' کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آج کل ''حکومت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (18:110)۔ ''ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کریں'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (18:26)۔ ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (12:40)۔ ''حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی''۔ اور اس کے بعد کہا أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (12:40)۔ ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو''۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح ''حکومت'' اور ''عبادت'' کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔ قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو' تو وہ ان کے سوا کیا ہیں أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ (26:22) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (23:47)۔ اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان معاملات میں بھی یہ مادہ' حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی' تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ہو سکے (۲) یہ خدا کی ''عبادت'' کر سکیں (يَعْبُدُونَنِي)۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (24:55)۔ ظاہر ہے کہ اگر ''عبادت'' سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ''خدا کی پرستش'' کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہٰذا ''اللہ کی عبادت'' سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔

ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کر کے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان کی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو عبید کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی تھی۔ عبید اور عباد۔ عبد کی جمع ہیں۔ عابد کی جمع عابدون اور عبدۃ ہیں)۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ہاتھ میں آئے ہوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنانے لگ گئے۔ اب انہی کو عبد اور عبید کہنے لگے۔ یوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنی پیدا ہو گئے (تاج)۔ چنانچہ قرآن کریم میں عابد کے معنی محکوم (23:47)۔ عبد کے معنی محکوم بنانا (26:22) اور عبد کے معنی غلام (2:178) واضح ہیں۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آ گیا ہے۔ چنانچہ اب تعبد اور تذلل ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ (یعنی مطیع و منقاد ہو جانا' قانون کے سامنے جھک جانا)۔ تعبد و تذلل کا یہی جذبۂ پرستش کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ اس سے عبادۃ کے معنی پرستش ہو گئے۔ قرآن کریم میں ہے قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا (26:71)۔ انہوں نے کہا' ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت درحقیقت مظاہر ہوتے ہیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلب منفعت یا دفع مضرت) کے خیال سے جھکتے ہیں۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظر اسی مادہ سے عبد یعبد آتا ہے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ہے (تاج ولین نیز کتاب الاشتقاق)۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (43:81)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہو سکتا ہے جس کے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس قسم کے رحمٰن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر دے (ابن قتیبہ (القرطین ج ۲/ صفحہ ۱۲۵)۔ (ایسے رحمٰن کو دور ہی سے سلام ہے)۔ واضح رہے کہ اگر عابدین کو عبد۔ یعبد ہی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرماں بردار کے ہوں گے۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں' لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرماں بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

العبد کے پہلے معنی انسان کے ہیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ پھر زیادہ تر یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا (تاج)۔

لہٰذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہو گا اس کے معنی ہوں گے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہوں گے۔ چونکہ جذبات اطاعت و فرماں پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آ رہا ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی

حیثیت دے دی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صلوٰۃ جوص۔ل۔و کے عنوان کے ماتحت درج ہے)۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع وسجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں دیکھئے اسلمت اور نعبد مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی کو الدین کہا گیا ہے (2:131-133)۔ نیز مسلمون اور عابدون اور مخلصون بھی (2:136;138)۔

(۲) جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ''خدا کی عبادت'' سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت۔ خدا کی محکومیت۔

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

(۴) عباد الرحمن کے معنی ہوں گے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلوٰۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت وفرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اس کی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان' زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) سے یہی مقصود ہے۔

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ ''قوانین خداوندی کی محکومیت'' اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی خوشگواریوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشوونما ہو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد' زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت' زندگی کی بلند' مستقل' اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ یہ (Self-Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے' فطرت کی قوتوں سے ڈر کر' انہیں خوش کرنے کے لئے' اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
021-35854919
Skype: AZURE.ABBAS
www.azharabbas.com

محترم جناب جاوید چوہدری صاحب کی خدمت میں چند گذارشات

محترم جناب جاوید چوہدری صاحب .T.V کے مشہور اینکر اور ایک معروف کالم نگار ہیں۔ .T.V کے دیگر تمام پروگرام چھوڑ کر ہم ان کا ہی پروگرام دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے پروگرام کے شروع میں جو تمہیدی و تعارفی کلمات کہتے ہیں، ان سے ان کی قابلیت نمایاں ہوتی ہے۔ البتہ ہم نے ان کا کالم کبھی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ کل گذشتہ روز ان کا ایک کالم ''عاشق نہیں اُمتی'' نگاہ سے گذرا۔ یہ کالم مشہور اخبار ایکسپرس کے 5 اکتوبر 2014ء کے ایشو میں طبع ہوا ہے۔ مضمون کا عنوان بہت اچھا ہے اور قرآنِ کریم کے مطابق ہے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ اس مضمون کے اندر تحریر فرمایا ہے وہ نہ تو قرآن کریم کے مطابق ہے اور نہ ہی ان کی علمی سطح سے کوئی مطابقت رکھتا ہے۔ مضمون چار کالمز پر مشتمل ہے۔ لیکن ہم صرف اس کے ایک یا دو ہی اقتباس پیش کریں گے۔ اور اس کے بعد ان کی خدمت میں چند گذارشات پیش کریں گے جو نہایت خلوص سے پیش کی جارہی ہیں۔ وہ ان پر غور فرمائیں۔ ہم تو ان کے لاکھوں ناظرین میں سے ایک ہیں۔ لیکن ہمیں وہ اس لئے عزیز ہیں کہ ہم روزانہ ان سے سکرین پر ملتے ہیں۔ وہ گھر کا ایک فرد ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ مضمون ان الفاظ سے شروع کیا ''ہم جب تک نبی اکرم ﷺ سے اپنی آل، اولاد، مال و دولت سے زیادہ محبت نہ کریں ہم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے۔ یہ دنیا کے ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ ہماری زندگی عشق رسول سے شروع ہوتی ہے اور عشق رسول پر ختم ہو جاتی ہے''۔ اس کے بعد آنجناب نے تحریر فرمایا ''مجھے نبی اکرم کی ذات مبارکہ سے عشق ہے اور میں اِس عشق میں غازی علم دین شہید کی موت مرنا چاہتا ہوں''۔ اس کے بعد جاوید نے ایک امتی ہونے اور سنت پر عمل کرنے پر بھی اصرار کیا ہے۔

جن جذبات کا محترم جناب جاوید چوہدری صاحب نے اظہار فرمایا ہمیں ان کے جذبات کا احترام ہے۔ لیکن جذبات سے الگ ہو کر اگر آپ غور فرمائیں تو حقیقت حال یہ ہے کہ اگرچہ عشق عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہی نہیں۔ اور نہ ہی قرآنِ کریم نے عشق خداوندی یا عشق رسول کا مطالبہ کیا ہے سارے قرآن میں، ہر جگہ اطاعتِ رسول کا حکم آیا ہے اور بار بار آیا ہے۔ امام راغب نے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان (7:49) کے معنے ''لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا'' کیے ہیں۔ ارشاد عالی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (9:23) حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے ''اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے۔ اسی آیت کریمہ میں اَحَبَّ اِلَيْكُمْ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے ''تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے'' کیا ہے۔ امام راغب نے اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ۔

مشہور درسی لغت مصباح اللغاۃ نے اس کے معنے فضیلت دینا کیے ہیں۔ اس نے استحبت الکفر علی الایمان کے معنے 'اس نے کفر کو ایمان پر فضیلت دی'' کیا ہے۔ لغاۃ القرآن میں مرقوم ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (3:31-32)۔ ترجمہ ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصوروں کو معاف کر دے گا اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔ اس آیت میں اللہ سے محبت کرنے کے معنے قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ کی تفسیر اطیعوا اللہ نے کر دی ہے اور اس کے مقابل میں تولوا (روگردانی کرنے) کے لفظ نے اس کی مزید وضاحت کر دی چنانچہ ان آیات میں بھی خدا سے محبت سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ جو اس نظام کے مرکز کی وساطت سے کی جاتی ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔

اِس کے بعد محترم جاوید صاحب نے بالکل درست بات تحریر کی ہے اور عاشق رسول ہونے کے بجائے امتی ہونے اور عمل کرنے پر اصرار کیا ہے۔ خاص طور پر سنت نبوی پر عمل کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند اور مبارک بات ہے۔ تحریک طلوع اسلام کا بھی یہی موقف ہے کہ اگر مسلمان حضور ﷺ کی سنت کا اتباع کرنے لگیں تو وہ یقیناً دنیا و آخرت میں سرخرو ہوں گے۔ سنت کے مفہوم کی وضاحت یہ ہے کہ جو اعمال حضور ﷺ نے ذاتی طور پر کئے اور جو حضور کے ذاتی معمولات زندگی تھے وہ سنت نبوی میں شامل نہیں ہیں۔ ان کا اتباع بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر حضور کسی دن مثال کے طور پر چاول تناول فرماتے تھے تو مدینے میں سب صحابہ اِس دن چاول نہیں کھاتے تھے۔ اگر حضور ﷺ کسی خاص رنگ کو پسند فرماتے تھے تو ضروری نہیں سب صحابہؓ اس رنگ کے کپڑے پہنتے۔ اگر حضور ﷺ خچر پر سواری کرتے تھے تو یہ عربوں کی معاشرت تھی' یہ دین کا حصہ نہیں ہے۔ حضور ﷺ اپنے نواسوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ حضور کا ذاتی فعل تھا اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی یہ سنت نبوی ہے اور نہ اس کا اتباع ضروری۔ اکثر علماءِ کرام نے اس موقف کی تائید و تصویب فرمائی ہے۔ خاص طور پر مولانا مودودی نے ''تفہیمات'' میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ جس کے بہت سے حوالہ جات اور اقتباسات رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہوتے ہیں۔ ہم مضمون کی طوالت کے پیش نظر ان کو یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔ ہاں البتہ جو کام حضور ﷺ نے اقامتِ دین کے سلسلے میں سرانجام دیئے ہیں یا دین کے استحکام یا اس کو رواں رکھنے کے سلسلہ میں سر انجام دیئے ہیں وہ ایک ایک کام سنتِ نبوی ہے۔ اور ان کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ ارشاد عالی ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)۔ ترجمہ: ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں) کو خدا کی طرف مضبوط دلائل کے ساتھ بلاتا ہوں اور میرے متبعین بھی۔ یہ ہے سنتِ رسول' علم و بصیرت کی رُو سے دین کو پیش کرنا اور دلائل و براہین کے زور پر دوسروں کو مطمئن کر دینا یہ سنتِ نبوی ہے۔ یہی ایک مومن کا شیوہ ہونا چاہئے۔ جو شخص دین پیش کرنے میں' اس طریقہ سے سرکشی اختیار کرے گا وہ سنتِ رسول کا مخالف ہوگا۔

آج اس دَور میں ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہر وہ نظریہ وعقیدہ، ضابطہ حیات، طریقہ زندگی، اور عقل انسانی کا وضع کردہ قانون، جو قرآن کے خلاف ہے وہ سب اندھیرا ہے ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (24:40)۔ ترجمہ: اندھیرے میں بعض پر بعض۔ ملوکیت کے اندھیرے پر سرمایہ داری کا اندھیرا، جمہوریت کے اندھیرے پر کمیونزم کا اندھیرا اس کے اوپر سوشلزم کا اندھیرا، اس کے اوپر نیشنلزم کا اندھیرا۔ نور صرف قرآن ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ (5:16)۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی، یعنی واضح کرنے والی کتاب آئی ہے۔ یھدی بہ اللہ، خدا اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے۔ یعنی ہدایت خداوندی صرف قرآن کی رُو سے مل سکتی ہے۔ اس راہنمائی کے ساتھ کچھ اور ملا دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ ترجمہ: اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ سارا یورپ، سارا امریکہ، اپنے باطنی اضطراب میں مبتلاء ہے۔ اِس دور میں اگر بجائے تشدد یا چیر پھاڑ کے، دلائل و براہین کے ذریعے اسلام کی تبلیغ کی جائے، تو ہو نہیں ہو سکتا کہ غیر مسلم متاثر نہ ہوں۔ وحی الٰہی میں خود اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس زمانہ میں تمام معاشرے Valueless ہیں۔ اپنے ذاتی یا ملکی، یا قومی مفاد کے مطابق اقدار بنا لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی مستقل اقدار ذہن انسانی بنا ہی نہیں سکتی۔ یہی مستقل اقدار قرآنی مملکت کی بنیاد ہوتی ہیں۔ یہ وہ اساس محکم ہے جو مسلمانوں کے علاوہ کسی کے نصیب میں نہیں۔ آپ قرآن کی مستقل اقدار پیش کریں، ہر قوم اس کو قبول کرے گی اور مسلمانوں کی شکر گزار ہوگی۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ حضور ﷺ نے سب سے زیادہ زور اقدار کی اشاعت اور ان کے ذہن نشین کرنے میں لگایا تھا یہ ہے سنت نبوی۔

ضمناً یہاں یہ بات عرض کی جاتی ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت میں ایسے بہت سے مواقع تاریخ میں درج ہیں جن میں حضور ﷺ نے کفار و مشرکین یا اہل کتاب کے سامنے دین پیش کیا۔ قرآنِ کریم کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل دیئے۔ خصوصاً ''ہماری تاریخ میں ایک واقعہ مباہلہ کا آتا ہے جس کی تفصیل ہماری ساری تاریخ کی کتابوں میں مندرج ہے۔ روایات کے مطابق اہل کتاب سے حضور ﷺ کا یہ مناظرہ تین روز تک جاری رہا اور اِس کی تفصیل موجود ہے لیکن کسی کتاب میں یہ تحریر نہیں ہے کہ حضور نے ان تین دنوں کے دوران کیا دلائل دیئے۔ اگر وہ دلائل کسی کتاب میں ہوتے تو وہ سونے سے لکھنے کے قابل ہوتے۔ اور ہم مسلمانوں کا سرمایہ حیات ہوتے۔ لیکن ہمارے مورخین کا علمی مزاج ہی نہیں تھا۔

حضورؐ کی دوسری سنت یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16)۔ ترجمہ: میں تم میں ایک عمر رہ چکا ہوں۔ کیا پھر تم نہیں سوچتے یعنی میری ساری زندگی تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میرا صدق، امانت و دیانت اور اخلاق حسنہ تمہارے ہاں ضرب المثل بن گئے ہیں۔ تمہیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جس پاک طینت انسان نے چالیس سال کسی پر جھوٹا الزام نہ لگایا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، کیا وہ ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ وہ معاذ اللہ خداوند قدوس پر اس قدر بڑا جھوٹ اور افتراء باندھ سکے۔ ہمیں اس آیت سے یہ اصول اخذ کرنا چاہئے کہ قائد اور لیڈر اس شخص کو بنانا چاہئے جس کا ماضی صاف و شفاف ہو اور داغدار

نہ ہو یہ ہے سنتِ نبوی کا اتباع اور یہ ہے سنت نبوی کی پیروی۔ جو حضرات عربی معاشرت کو دین کا ایک حصہ گردان کر ایک خاص طرح کی تراش وخراش اور ایک خاص وضع کا حلیہ بنانے کو اتباع سنت قرار دیتے ہیں وہ غور کریں کہ ان میں کتنے حضرات اتباع سنت میں اپنے ماضی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ کی سب سے بڑی سنت یہ ہے کہ آپ نے قرآنِ کریم کا نظام قائم فرمایا۔ اگر قرآنی نظام قائم کرنا فرض نہ ہوتا تو رسول اللہ اس درجہ مصائب برداشت کر کے اس کو کیوں قائم فرماتے۔ حضورؐ نے اپنے دشمنوں سے 82 دفاعی لڑائیاں لڑیں۔ لیکن اپنے مطمح نظر کو Ignore نہیں کیا۔ اگر اسلامی مملکت کا قائم کرنا حضورؐ پر فرض نہیں تھا تو کیا حضورؐ نے اپنے فرائض منصبی سے تجاوز کیا تھا۔ یہ بات ہرگز نہیں تھی بلکہ نظام کا قائم کرنا حضور پر فرض تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (48:28)۔ ترجمہ: وہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور گواہی کے لئے تو اللہ ہی باقی ہے۔ اسی آیہ کریمہ کو سورہ توبہ اور سورہ صف میں بھی ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ پر فرض تھا کہ وہ اسلامی نظام قائم کریں۔ آیہ کریمہ میں ھدیٰ اور دین دونوں الفاظ آئے ہیں۔ ھدیٰ قانون اور ضابطہ کی شکل میں قرآنِ کے اندر ہے اور جب اس ھدیٰ کو عملاً متشکل کر دیا جائے تو یہ ایک نظام کی شکل اختیار کرتا ہے جو دین کہلاتا ہے۔ ہدایت اور دین دونوں منزل من اللہ ہیں۔

قرآنِ کریم نے طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنے کو جرم قرار دیا ہے 6:23 ہم جس نظام کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں قرآن کی رُو سے وہ جرم ہے۔ اسی وجہ سے جب مدینہ میں حضور نے اسلامی نظام قائم فرما لیا تو مکہ کے مسلمانوں پر ہجرت فرض ہو گئی اور حکم ہوا کہ جب تک وہ ہجرت کر کے مدینہ نہ آ جائیں ان سے کوئی رابطہ وتعلق نہ رکھو۔

ختم نبوت کے بعد چونکہ کسی نبی کو نہیں آنا تھا اس لئے اقامت دین کی ذمہ داری امت کے سپرد کی گئی۔ صدر اول کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں میں ملوکیت شروع ہو گئی اور اسلام کا نظام ختم ہو گیا۔ خود حضورؐ کے دور میں یہ نظام دس لاکھ میل پر مشتمل تھا۔ اور حضور نے اپنے مبارک عہد میں مقامی حکام بھی مقرر کر دیئے تھے جن کی معرفت رسول اللہ کی اطاعت ہوتی تھی۔ اور ان کو ہی قرآن میں اولوالامر کہا گیا ہے۔ ہماری پیشوائیت کے نزدیک بھی اولوالامر کی اطاعت اتنی ہی ضروری ہے جس قدر رسول کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اور یہ اولوالامر صرف اسلامی مملکت میں ہی ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کو حکم تھا کہ قرآن کریم کو فوراً انسانیت کو پہنچا دو۔ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (5:67) جو تم پر نازل ہوا ہے وہ پہنچا دو۔ وحی الٰہی اگر تلواریں چلنے کے دوران بھی نازل ہوتی تو اس کا پہنچانا ضروری تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ پر یہ بھی فرض تھا کہ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5::48)' اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو ظاہر ہے کہ جس مملکت میں قرآن کے مطابق فیصلے ہوں گے وہ اسلامی مملکت ہی ہو سکتی ہے غیر اسلامی مملکت میں تو قرآن کے مطابق فیصلے نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم تو ما انزل کے علاوہ کسی قانون کو قانون سند نہیں کرتا۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ' الظّٰلِمُوْنَ' الْفٰسِقُوْنَ (5:44; 5:45; 5:47)' جولوگ قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر' ظالم اور فاسق ہیں۔ سورہ کہف میں ارشاد ہے لَا يُشْرِكُ..... اَحَدًا (18:26)۔ ترجمہ: وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ہم مسلمانوں نے ان واضح وقطعی احکامات کے علی الرغم اللہ کے حکم کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ احکامات وقوانین کو بھی شامل کیا اور کھلم کھلا شرک کا ارتکاب کیا۔ محترم جناب جاوید چوہدری صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اِس طرف توجہ فرمائیں کہ جو شخص قرآن کی رُو سے' مشرک' کافر' ظالم اور فاسق ہے۔ کیا اس کا عشق اور محبت بارگاہِ خداوندی میں کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم مسلمان پیدائشی مسلمان ہیں۔ اور صرف مردم شماری کے رجسٹر کے مسلمان ہیں۔ ہم قرآنی مسلمان نہیں ہیں۔ پیدائشی ہونے کے علاوہ ہم میں سے کوئی شخص خود ایمان نہیں لایا۔ قرآن تو انسانوں کو قانون وضع کرنے کا اختیار ہی نہیں دیتا۔ اسلامی مملکت کا کانسٹی ٹیوشن صرف قرآن ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت قرآن کے قوانین واحکام جاری کرتی ہے۔ چونکہ یہ مملکت صرف قرآنی احکام جاری کرتی ہے۔ اس لئے اس مملکت کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عبادت خداوندی ادا کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

اسلامی مملکت کے ذریعے اللہ کے وعدے پورے ہوتے ہیں (11:6) اسلامی مملکت کے ذریعے اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ (47:7; 22:40) اسلامی مملکت کے ذریعہ دعائیں پوری ہوتی ہیں' اسلامی مملکت کے جو ثمرات حاصل ہوتے ہیں ان کے تذکرے سے طلوع اسلام کے رسائل بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں جناب جاوید کے گوش گذار صرف اتنی بات کرنی ہے کہ سب سے اہم ترین بات اقامتِ دین ہے۔ موجودہ دور میں وہ صرف اِس نکتہ کی طرف ہی توجہ کریں۔ جو حضرات اِس دور میں اقامت دین کی کوشش کر رہے ہیں ان کا ساتھ دیں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے شہید کا لفظ اس معنے میں استعمال ہی نہیں کیا جس معنے میں ہم اس کو استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس معنے میں المقتول فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ 2:154 ;3:169۔ جبکہ شہید' شہدا کے الفاظ بہت مقامات پر آئے ہیں اور قرآن نے اس کے معنے گواہ اور نگران کے کئے ہیں۔ (4:135 ;5:8)۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ المقتول فی سبیل اللہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اقامتِ دین کی کوشش کرتے ہوئے قتل ہو۔ (4:76) اس کے علاوہ یہ مرتبہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر محترم المقام جاوید چوہدری یہ مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت میں ان کی یہ آرزو ہے تو انہیں لازم ہے کہ وہ اقامت دین کی کوشش کریں۔

ایک بات اور بھی واضح کرنی ضروری ہے کہ آج کل اسلامی حکومت کا چرچا عام ہے۔ اسلامی مملکت تو ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس نظام کی تو اساس ہی الاسماء الحسنٰی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نام السلام' الرحمٰن' الرحیم' رب' رازق اور رؤف ہیں۔ اس نظام کی اساس یہ صفات باری تعالیٰ ہوتی ہیں۔ انسانی ذات میں نہ صرف یہ کہ یہ تمام صلاحیتیں خوابیدہ (Darmant Latent) موجود

ہوتی ہیں بلکہ انسانی ذات ان تقاضوں کو پورا کرنے کی ہر وقت سعی و کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس لئے اس معاشرہ میں سلامتی، رحم، ربوبیت وغیرہ ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (24:55) اے ایمان والو تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اعمال صالحہ سرانجام دیئے ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین پر ضرور غلبہ دے گا، جس طرح ان لوگوں کو غلبہ حاصل ہوا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور ان کے اِس دین کو قائم کرے گا جو اس نے پسند کیا ہے۔ غور فرمائیں قرآن کریم نے کیسے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ازخود یہ نتیجہ ہے کہ اس قوم کو غلبہ و تمکن حاصل ہوگا۔ اس کے لئے کسی فساد، تشدد Voilence چیر پھاڑ کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ سورہ یونس میں ارشاد ہوتا ہے وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (10:82)۔ (مفہوم) اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ محکم کے ذریعے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے نظامِ حق کو قائم کرتا ہے۔ خواہ اس کا ثبات ان لوگوں پر کتنا ہی گراں گذرے جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے۔

یہ بات بھی خیال میں رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے براہِ راست کوئی معاملہ نہیں کرتا، یہ بات اس کے مقام بلند اور اعلیٰ مرتبہ کے خلاف ہے کہ وہ اپنے بندوں سے براہِ راست کوئی معاملہ کرے۔ وہ اپنے بندوں سے رسول کے واسطے سے معاملہ کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات، اس کے کلام، اور اس کے احکامات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے از بسکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کی یہ اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (4:80) جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ رسول کا ہاتھ لوگوں کے لئے اللہ کے ہاتھ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ بالواسطہ اللہ کے ہاتھ پر ہی بیعت کرتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (48:10) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے ذریعے ہوتی ہے اور رسول کی اطاعت اس کے اپنے مقرر کردہ مقامی، (اولوالامر) کے ذریعے ہوتی ہے۔ اولوالامر کی اطاعت بھی رسول کی اطاعت کی طرح فرض ہوتی ہے (4:59) رسول کی وفات کے بعد رسول اللہ کی اطاعت ان کے جانشین کی معرفت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس نظام کے سربراہ حضرت ابوبکرؓ تھے اس لئے حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت رسول اللہ کی اطاعت تھی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی نظام کا سربراہ آپ کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔ اس کی وضاحت خود حضور نے فرمادی تھی۔ (ترجمہ) رسول اللہ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، تو اس نے میری نافرمانی کی۔ حضور ﷺ کی اس حدیث، اور اس جیسی اور احادیث سے یہ بات شیشہ کی طرح صاف ہوجاتی ہے کہ رسول

اللہ کو ماننے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد ان کے جانشین اور سربراہِ مملکتِ قرآنی کی اطاعت کی جائے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ اطاعت رسول کا واحد ذریعہ اسلامی نظام کی اطاعت ہے اور اگر وہ نظام قائم نہ ہو تو اطاعت رسول ہو ہی نہیں سکتی۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے تحریر فرمایا ''عبادت کسی کی کرنا اور اطاعت کسی اور کی کرنا' دونوں باتوں میں ایک کھلا تضاد ہے جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہوسکتا ہے جس کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہوگیا ہو''۔ تزکیہ نفس۔ صفحہ 347

سرمد در دین را عجب شکستے کردی
ایماں بہ خدائے چشم مستے کردی
با عجز و نیاز جملہ نقد خود را
رَفتی و نثارِ بت پرستے کردی

فَسَتَذْكُرُونَ مَآ أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِيٓ إِلَى اللَّهِ (40:44)

میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں تم اس کو یاد کرو گے' اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

نکل جاتی ہے سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

☆.....☆.....☆

DRESSES FOR DIFFERENT EVENTS

Engagement is one of the most memorable occasions of one's life. It bonds two people together for the life time. Due to this reason this event is celebrated by family of groom and bride with proper preparations. Bridal engagement dresses are also very important part of preparations of engagement.

We at VARIATIONS understand the importance of these occasions and have expertise and experience in preparing dresses of

ENGAGEMENT | NIKAH | BRIDAL | PARTY

Contact us with confidence

FAREEHA KHAN
VARIATIONS

Variations.fk@gmail.com
0092 3060676933

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

آرٹ اور اسلام
اسلام آگے کیوں نہ چلا؟
اندھے کی لکڑی
جہاں مارکس ناکام رہ گیا
دوقومی نظریہ
عورت قرآن کے آئینے میں
قرآن کا معاشی نظام
کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
مقام اقبالؒ
مقام محمدی ﷺ
ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟
(مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)
پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
ہم عید کیوں مناتے ہیں؟
قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

قیامت موجود
الزامات اور ان کی حقیقت
کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
تحقیقِ ربوٰ (مسئلہ سود)
ہماری تاریخ میں کیا ہے؟
اسلامی آئیڈیالوجی
گہری سازش
(20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)
اسلام کیا ہے؟
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟
بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
حرام کی کمائی
روٹی کا مسئلہ
قرآن کا سیاسی نظام
قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر
کافرگری
مرزائیت اور طلوع اسلام
ماؤزے تنگ اور قرآن
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
(قرآنی اصطلاحات کی تشریح)

انسانیت کا آخری سہارا
نماز کی اہمیت
ہندو کیا ہے؟
ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری
اسلام اور مذہبی رواداری
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟
ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اسلامی قانون سازی کا فریضہ
(بال سے باریک تلوار سے تیز)
مومن کی زندگی
علماء کون ہیں؟
قربانی
فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
قرآن مجید کے خلاف گہری سازش
تکذیب دین کون کرتا ہے
اور مصلّٰی کسے کہتے ہیں
اقبال کا مردِ مومن

قرآنی پمفلٹس

صحیح قرآنی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے میں قرآنی فکر پر لکھے گئے چھوٹے پمفلٹس نے بھی بہت ہی اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ احباب اِن پمفلٹس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو تقسیم بھی کرتے ہیں اس لئے اِن کی قیمت اصل لاگت سے بہت ہی کم رکھی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ صاحب ثروت احباب اِس کمی کو اپنے عطیات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سلسلہ ابھی بھی محدود پیمانے پر جاری ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس سلسلہ کو مزید بہتر کیا جائے لہٰذا صاحب ثروت حضرات سے مزید عطیات کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآنی فکر کے کام میں مزید وسعت پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں اور اپنے عطیات ''پمفلٹس فنڈ'' کے لئے بھجوائیں تاکہ پمفلٹس کی طباعت اور دوسروں تک قرآنی فکر کو پہنچانے میں ہم کامیابی حاصل کرسکیں۔

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ بنام ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2' لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465 نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

Surah *Al-Naba* (النباء) – Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 1

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends! Today is May 18, 1984 and today's lecture starts with the beginning of Surah Al-Naba (النباء) (78:1).

Allah's revelation and human mind

If you remember I have kept on reminding you right from the beginning of Parah (جز) 29 that the confrontation between Truth (*Haq* حق) and Falsehood (*Baatil* باطل) has been going on ever since the human mind opened its eye to the light of Allah's revelation. The stories of the chain of prophets that the Quran has narrated started with Prophet Noah (PBUH). And you will observe that in the entire Quran it is these stories of confrontation of past nations with their Prophets that play a central role in their Prophetic mission. In the beginning, the sphere of their influence and the scope of their message were limited and localized since towns and communities were very small in those ancient days. The Quran says that Allah sent His messengers in every village, in every town, in every community. Thus the confrontation between prophets and the proponents of status quo were similarly limited in scope and size. Subsequently, as the population and size of towns kept increasing, the messengers' sphere of influence also kept on expanding until finally the last Prophet (PBUH) came with a global reach and influence since he was sent to humankind at large: كَافَّةً لِّلنَّاس (34:28). The sphere of confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) likewise became also global in scope with the advent of Prophet Muhammad (PBUH). His 23 years of life as a Prophet is nothing but the story of this confrontation that kept on gathering pace as his Quranic mission slowly advanced. The Quran therefore presents this confrontation also in a step-by-step evolutionally manner.

My dear friends! It seems that in the last parts of the Quran the story of this

confrontation and the subsequent revolution entered its last throes because the Quran has attributed this as a decisive moment; as a period of separating truth from falsehood. In part 30 of the Quran this last phase of the confrontation has been described in a highly focused form – with shorter chapters having short verses. Don't ask about some verses consisting of just two words as to how rapturous they are containing extraordinary depth of meaning that human mind is left in awe! We are opening the background of this lecture from the moment – when the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) that started from the day when humans took their initial guiding steps in the light of Allah's revelation, and the forces of falsehood and injustice stood up against this guiding light of revelation.

The story of Adam and the story of Satan

You have seen the story of Adam in the Quran. After so many years of these Quranic lectures you know that this is not the story of a single man, or that of any husband and wife. But this is story of man himself; it is the story of humankind; it is your and my story. The Quran has described this story in metaphorical form and its highlight is that both Adam and Satan (or Iblis) appear on the stage at the same time. When human appears on the scene and when he becomes aware of his consciousness then it is said to him: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى (2:38) – there shall, none the less, most certainly come unto you guidance from Me [Asad]. And if you tread under its light then you will have no fear or grief: فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) – and those who follow My guidance need have no fear, and neither shall they grieve [Asad]. But the Satan is right there standing in front of Adam. What we call fall of Adam is really the start of man's life on Earth with concurrent start of the life of Satan because Satan asked God's permission to be with man as along he exists on earth. So, there you have it: the confrontation between human and Satan started right from the beginning of human life on Earth and it will continue until the last breath of the last human.

I will tell you shortly what really the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) is. We keep on hearing and repeating these words – confrontation

between Truth (حق) and Falsehood (باطل). But we never stop and think and focus our attention to find out what it really is. Let us try to do that. At the outset let us make one thing absolutely clear. Whatever the details of the confrontation may be, at its very core, it must be tangible, practical, and perceptible; not abstract, academic, or conceptual – so that one can clearly see what truth is and what falsehood is; what the struggle is all about, what the reality of the confrontation is and why? Why was it that the moment Adam appears on the scene Satan also appears right away on the stage? To handle this question Zoroastrian and Christian concepts said that God created evil along with good and consequently debates started in religious circles about its pros and cons. But one needs to clarify this issue: Why did Adam and Satan appear on the stage exactly at the same time? And why was Satan given leave until the last Day, metaphorically speaking? This is worth pondering. Then only the message of the Quran, the essence of *Deen* could be understood. Arabs adopted this word Satan with its root ش - ط - ن which means one who inflames, one who enrages. But the word "Satan" is originally derived from Hebrew which means "the hinderer".

Religious priesthood – the biggest hinderer in humanity's path

The Quran says again and again that religious and spiritual leaders and scholars are the biggest hindrance in the path of Allah: يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (7:45) – Those who would hinder (people) from the path of Allah [Yusuf Ali]. In chapter 9 (Surah Al-Tauba) and in many other places in the Quran it is mentioned that capitalists as well as those who acquire power by force, by unjust and corrupt means, are also hinderers in the path of Allah along with the religious priesthood: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (9:34) – O ye who believe! There are indeed many among the priests and anchorites, who in Falsehood devour the substance of men and hinder (them) from the way of Allah. And there are those who bury gold and silver and spend it not in the way of Allah announce unto them a most grievous penalty [Yusuf Ali]. But the religious priesthood is the biggest roadblock in the path of Allah because capitalists and rulers owe their existence on the support and help offered by religious

priesthood. All these three evil forces create chains of subservience and dependence for the rest of humanity. They are hinderers in the path of Allah as no human wants to live under subservience and dependence of other human beings. There is a deep voice inside humans which incites them to rebel against such dependencies. But religious priesthood pacifies them against such rebellion by instilling in their hearts the false notion that their state of such dependence and subservience is from Allah. They tell people: Don't feel bad about it even in your heart because this will be considered a transgression against Allah while all the while these priests themselves are the real transgressors of Allah. The Quran says: يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (7:146) – all those who, without any right, behave haughtily on earth [Asad]; and are roadblocks and hinderers in the path of Allah: يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (7:45). Thus capitalists as well as kings – or any form of human rule over humans – are also hinderers in the path of Allah. But fundamentally it is the religious/spiritual priesthood that is the biggest roadblock in His path. And the entire history of the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) is nothing but this history of struggle between Allah's *Deen* and religion manufactured by priests and anchorites.

Allah sent His *Deen* to guide the human caravan on the road that leads towards Him. But the proponents of religion stood in its way and proclaimed, rather boldly and hypocritically, that *we* will take you there. The Quran says, however, that they are, in fact, the biggest roadblock in His way. And, hinderer – the Hebrew word for Satan – clarifies this whole scenario beautifully. Since we are talking about Satan, let us dig this a little deeper.

Our current concept of Satan

My dear friends! Please understand that our current Islam is "*Ajami* or *Iranianized* Islam". In this version of Islam there are two equal powers – one of good (*Yazdan* or God) and the other of evil (*Ahrman* or Satan). Our concept of Satan is also similar. But we don't ever think about it that in this Satan we have assigned attributes that – God forbid –have turned him into God. Our concept is that the Satan is everywhere

with everyone wherever one is. But the Quran associates this attribute to Allah: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) – And He is with you wherever you may be [Asad]. Thus what was Allah's attribute we made it Satan's attribute and never thought that the Quran does not talk about one Satan but many Satans: شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ (6:112) – *Shayatin* (devils) among mankind and djinns [Al-Hilai & Khan] – i.e., those that are visible to the eyes (humans) and those that are hidden from eyes (djinns). And the biggest Satan that is hidden from the eyes resides inside humans themselves. And it is this Satan that stands as a roadblock in the straight path of Allah but our mind's eye is searching for him elsewhere. It is so sad that our religious scholars do not see the white elephant of hell staring at us here while they keep talking about the heaven of the hereafter.

Emotional roadblocks at every step

My dear friends! After a while you will soon realize that our entire society has become satanic. There are troops of Satan everywhere. Leave aside Truth (حق). This is a big thing. Does anything today get done according to appropriate rules and regulations in our so-called Muslim countries today? Hindrances abound at every step. Did you see this meaning of Satan as a hinderer how it clarifies the meaning: شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ (6:112) – *Shayatin* (devils) among mankind and djinns – hinderers in the way? The confrontation between *Deen* and religion is in fact confrontation between the Messengers of Allah and these شَيَاطِينَ – Hinderers (devils) in their path. My dear friends! This is the last part (جز 30) of the Quran. As it is I am reaching the end of my life. I therefore think that it is necessary to explain things in the light of the Quran boldly and clearly.

It is wrong to believe in any power opposed to Allah

My dear friends! Why did the Satan appear on the same stage as Adam? Zoroastrianism (Old Iranian) belief is that there are two permanent powers in the world always at war with each other: one of light and the other of darkness; one called Yazdan (God) and the other Ahrman (Devil). It says that besides the Devil there is no

other power in opposition to God engaged in war with Him. The Quran contradicts this view and says that this Dualism is Shirk (شرک). Therefore it is necessary to refute this concept. Let us see why?

Confrontation is necessary to realize latent potential

My dear friends! There are so many hidden powers, qualities, and faculties in every human in potential form that most are not even aware of. These can only be realized by struggle, confrontation and friction. Whether it is the fire hidden in a flint or the music concealed in a string – it requires friction or strike to realize these hidden qualities. The purpose of human life is to practically actualize these hidden qualities. For this the word is "self-actualization" or "self-realization". You can also call it realization of humanity. It is only through the realization of these hidden human qualities that humanity gradually advances forward. These powers do not come from outside but reside inside humans, as if they were hidden in their DNAs – and they require some jolt and exertion to be realized. We normally hear that Allah tests His pious servants. The question begs as to what it means by "testing his pious servants?" You only test someone who claims to be your friend because you are not sure about his sincerity. If you are confident and know that he is sincere then you trust and rely on him for his support whenever the need arises. But that cannot be said about Allah. He has knowledge of everything hidden in the Earth and the heavens. Allah does not test humans but provides opportunities so that they can test themselves; so that they can find out for themselves how much power they have to overcome challenges of life; so that they do not remain under the illusion of having those qualities that when are confronted with challenge they buckle under pressure. Likewise, those who have the abilities but are suffering from inferiority complex these opportunities provide them to become confident about their abilities. That is why confrontation is so critical in bringing out the truth of those qualities; that is why it is so important to test the waters to expose self-delusion or to confirm self-affirmation.

Now since we have come so far let me repeat a joke that I have often mentioned

before. Someone said that this elderly person used to be wrestler. A young person asked him: Mr.! That was a different time. You had great strength back then but today you are taken over by old age. So, it is not the same thing. That you have changed. The person replied: No, it is the same thing; that no change has occurred in me. The young man did not believe him and asked him to prove it. The person said that let us go to the rink where a boulder was lying in the corner. He started to push the boulder but it wouldn't budge. On this, the young man remarked: Didn't I tell you that you have changed? The person replied: No, I haven't changed. The boulder didn't move then and it doesn't move now!

Human self-delusion has made God an idol

My dear friends! Humans remain in a mode of self-delusion because idols don't talk back. And that is the reason idol-worship is such a flourishing business. We, Muslims, have also made Allah an idol because "our God" does not talk back as well! We also console ourselves that we have the same strength. But it is important that we test our strength and not remain under self-delusion. Self-examination is a great thing. That is why we need confrontation; we need to be jolted; we need to be pushed and pressed, and passed through friction. Then only will we know what our real strength is. This is the secret of success and the essence of dignified life. If there are no opposing confrontational forces requiring human struggle and challenge, the latent human potentials will never be realized. Iqbal has put it beautifully through a dialogue between Gabriel and the devil Iblis. Iblis asks Gabriel:

If you get a private courtship with Him, then ask the Almighty Allah;

Whose blood it was that made colorful the story of Adam, O Allah?

Or,

Having a tasteless world, fun is not;

That God is present but Satan is not!

Where there is no confrontation, where there is no challenge; where is no struggle –

that world is tasteless and colorless. Please think about it! Iqbal presented the confrontation between religion and *Deen* in a very colorful way. Satan is taunting Gabriel:

I keep on pinching in the heart of God like prickly thorny bristles;

But you do nothing but recite: God exists, God exists, God exists!

Let the Satan reign supreme. Nothing to worry! But you keep on reciting God is great! God is great! Use your tongue while the Satan uses his big stick! You keep sinking in the ground while the devil keeps rising into the sky with evermore force! While the devil is raining bombs and missiles you, the pious ones, get your rosaries (*Tasbeeh*) and get busy reciting "God is great" on its beads! This is religion my friends! *Deen*, on the other hand, dares its opponents to come out; and confronts them boldly and courageously. Did you notice why the Satan came at the stage right when Adam came; and why the Satan has been given leave to be with Adam until the very last Day? However, there are times when the Satan had been subdued. It is a different matter though that the Satan is dominating humans nowadays. But he was not created to dominate humans. There are enough powers inside humans that, what to say of one Satan dominating humans, a troop of them can never dominate humans, if humans are able to realize those latent powers in light of the revelation of Allah. Humans, in fact, are dominated by their own internal devils. External devils come later. And then the entire society is taken over by their troops. What do they do? They become roadblocks and hinderers in the path of Allah; become hinderers in the path of humanity. They do not let anything move properly and regularly according to rules and regulations.

Selfish-intellect vs. Cosmic-intellect

My dear friends! After this rather long introduction let us move forward. What *is* this confrontation? I have described it as confrontation between *Haq* (حق) and *Baaatil* (باطل). This is a comprehensive term of the Quran. Within *Haq* (حق) is contained the entire Islam, the entire *Deen*. Opposed to this is *Baaatil* (باطل) consisting of all other

powers of the world, consisting of man-made systems of life. These are only two words – *Haq* (حق) and *Baaatil* (باطل) – but their account is the entire Quran. It sums up the entire edifice of *Haq* (حق) and *Baaatil* (باطل) and delineates the crux of this matter by its opening and closing statements concerning nourishment and sustenance of all humankind: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) and قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1). Nourishment and development all humankind – the Quran starts and ends with this universal goal. This is the heart of the Quran's message. Nowadays, everyone is worried about one's own benefit. And, if someone is worried about the humankind – he is labeled as insane. But this mad one is the clever one indeed, in the words of Saadi Shirazi (1184-1291). But the society thinks one is clever who always thinks of his own benefit, not of others. And the circle of benefits from the individual keeps on expanding to one's family, to one's tribe, to one's nation. That is where humanity stands today – focused on the concept of one's own circle of benefits not on others', resulting in collective hell.

This internecine hell is the creation of the concept "I and You"

My dear friends! The present situation in the world is the creation of the mindset of– *me*, *my* family, *my* tribe, *my* nation. This is *Baaatil* (باطل). What is *Haq* (حق) then? It is universal benefit, a policy of welfare for all humankind. The starting point for this? Think of benefiting the person standing next to you when you think of your own benefit; think of other family's or other tribe's or other nation's benefits when you think of your own family's benefit, your own tribe's benefit, or your own nation's benefit. This way by enlarging the circle further and further the circle of benefit encompasses the entire humankind. Thus the benefit becomes universal in character and scope by breaking all local, regional, and national boundaries. These boundaries only exist as along as the distinction of "I and You" is there. When this distinction disappears then the question of "us vs. them" disappears as well. The Quran simply wants to enlarge the concept of family to a universal family because Quran's Allah is sustainer all the worlds and He is the provider and the nurturer of all humankind– (*Rabbil Aalameen*) رَبِّ الْعَالَمِينَ; and (*Rabbil Naas*) برَبِّ النَّاس. The Quran advocates

universal sustenance for all humans without any distinction of any kind. This is the only way the benefits will remain forever for all humankind everywhere on earth. This is the only way to avoid human hell on earth. The Quran says: وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) – that which is of benefit to humankind abides on earth [Asad]. Go over the entire Quran from this point of view and you will find in it that one's benefit, in fact, is in the benefit of the entire humanity and vice versa. The root of confrontation of all human problems on earth is: selfish intellect vs. the cosmic intellect. Iqbal has put this beautifully: the intellect that looks for only its own benefits is unaware of the benefit of others. The reason Iqbal gives for this is that: selfish-intellect and cosmic-intellect are two different things. Iqbal does not go after intellect as religious scholars do to denigrate and condemn it. He accepts intellect as a great power; but says that intellect is of two types: 1) selfish intellect and 2) cosmic intellect. The universal sustenance does not happen by extinguishing the light of intellect but by using it at the cosmic level – the intellect that works under the guiding light of Allah's revelation. Then it becomes cosmic-intellect, holistic-intellect, or higher-intellect. When this happens the selfish-intellect submerges into cosmic-intellect as their benefits then get synchronized with each other. This is the essence of the Quranic message – human intellect is essential but it must work under guiding light of the revelation. Again Iqbal illustrates this in his own God-given style:

Selfish-intellect is not aware of anyone else's benefit;

It sees only its own, doesn't care about other's benefit.

But Allah's revelation realizes all of humankind's benefit;

Its eye perceives the welfare of all humankind and benefit.

This is *Deen*. This is Islam. This is Truth (حق). End of the matter. Confrontations that happened with all the Prophets (PBUT) were essentially about this: humankind benefit (حق) vs. individual benefit (باطل). This is really the bottom line. When the curtain lifts in the very first scene of this confrontation, what do we see? We see the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل).

David vs Goliath

My dear friends! Look at the very first recorded period of human history, that of Prophet Noah (PBUH). What do you see? You see a society where the rich and powerful class rules and controls the rest of the people; where upper class elites do not even want to sit with those whom we now call the working class people. The elite class complained to Noah (PBUH) that you are giving importance to workers and treating them with dignity. This cannot happen. First, you have to get rid of these people before we would listen to you. This was the confrontation that Noah (PBUH) faced. And this was the case with every prophet in every period. This confrontation had reached its apex during out Prophet's time. Tribe, race, predatory capitalism, priesthood – all these evils based on extreme selfishness were simultaneously present in the society. And the confrontation with the Prophet (PBUH) kept on steadily increasing in intensity during his 23 years of life as Prophet. Prophet Muhammad's life story is the story of this confrontation. So is the story of all the previous Prophets (PBUT). This is the history of humankind. Leave aside that period. Today, it is the same old confrontation going on in every department of life. Everyone tries to trample on others for the sake of his own benefit. People trample each other not just in bazars but also in mosques – even in the most sacred of places Ka'aba – because everyone cares for one's own welfare and benefit, not of others'. Everyone thinks of how to advance oneself by putting roadblocks in the path of others. This has become a systemic problem. As a result, nothing works according to rules and regulations. Corruption has taken over the society like a cancer. If things worked smoothly without any hindrance then people wouldn't behave so desperately. This is what happens when roadblocks and hindrances are erected in in the path of everyday life. My dear friends! This is جحیم (*Jaheem*) according to the Quran. The theory of evolution has now reached the level of science. According to this theory every species struggles with other species resulting in a confrontation. If a species has developed enough power of defense to stand up to the other species then it survives. If it stops at a place and is not able to overcome the obstructions then it is

finished forever. But if it overpowers the other species then it moves forward in its path of evolution. This pattern of moving forward is the *Deen*. It is Islam. To move forward in the path of Truth (حق) by overcoming all the barriers and hindrances is the *Deen*:

Shying away from the tang of action leads to captor's way;

Once one folds one's hands, he becomes the hunter's prey.

And that is the reason the Quran has used the word جحیم (*Jaheem*) for hell.

Another name of universal sustenance is *Deen*

My dear friends! As we mentioned before جحیم (*Jaheem*) means getting stuck at one place and not being able to move forward. The Quran says about the people of heaven: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10) – But the foremost shall be (they who in life were) the foremost (in faith and good works) [Asad]. They have also been referred to as وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) – And the first to lead the way [Pickthall]; and أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (56:11) – they who were (always) drawn close unto God! [Asad]. To move forward in the path of *Haq* (حق) to improve the human condition, to advance humanity to higher and higher levels, to make universal sustenance available to all: – this is Islam; this is *Deen*; where the mission is always to move forward, always to move ahead. This is the law of evolution; this is the law of requital; this is the law of nature; this is the law of the Universe. To put barriers and hindrances in this path – this is falsehood; this is باطل (*Baatil*). And when these barriers and hindrances become part of a society then that society becomes hell.

My dear friends! This is جحیم (*Jaheem*) where people are not able to move forward in the path of humanity; where all programs for human improvement are blocked. People cry in pain and suffering but no one listens to them. As a consequence depression and hopelessness set in. You know that in the Quran the devil is called Satan – the hinderer. But he is also called *Iblis* – the purveyor of hopelessness and depression and despondency. When so many roadblocks are put in our path and we are not able to remove them; when we do not know what to do – then we become

hopeless and depressed. Satan and Iblis are two sides of the same coin. So many barriers; so many devils working hard for their own short term benefits unconcerned with the rest of the suffering masses so much so that the entire society becomes enflamed in lawlessness on one side and engulfed in gloom and doom on the other. Internecine hell pervades the entire society.

The initial period of the Prophet's life

My dear friends! Let us focus on the Prophet's early life. This was the life of Mecca full of confrontation and struggle to the extent that the Prophet (PBUH) was forced to migrate to Medina. Even then the Meccans did not leave him there in peace. They waged full scale wars against him in Medina. For seven years until the end of Prophet's life these wars and battles continued. The Prophet (PBUH) and his companions confronted their enemies head-on and did not buckle under the enemy's higher number and superior resources. These confrontations, one after the other, were instrumental in bringing out the hidden potential and latent powers within the companions with even higher intensity than before: أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (48:29) – they are firm and unyielding towards all deniers of the truth [Asad]. This means that at every confrontation their latent and hidden strength increased with even more intensity than before until the last stage was set in this confrontation.

The style of the Quran

My dear friends! I have mentioned this many times that the realities described by the Quran are unique, and without parallel anywhere. There are no doubts at all in Quran's descriptions. The Quran has thrown an open challenge to the world and says that all humans working together cannot produce a document like this. Also, the style of the Quran itself is unique and unparalleled; and this is also a challenge to the world. No one has been able to produce a literary style that can match the style of the Quran. Mu'arra, a famous Arabic poet, wrote a book called "*Risalatul Buhran*" claiming a high literary style. But literary Arabic experts like Dr. Taha Hussein rejected this claim. They said that style of the Quran is something altogether

different. Therefore, even if the Quran is viewed from literary point of view then also it is a miracle. The Quran is the easiest book in Arabic language. After learning some rudimentary Arabic grammar, if I have to start teaching any Arabic book then it would be the Quran. This is such an easy book and its style is so beautiful and appealing that any great literary scholar will feel rapturous by its literacy style.

The first sign of defeat – feeling doubtful about a program

Dear friends! The Quresh were united in their opposition to the Prophet (PBUH) and his companions. They had no doubt in their minds that they would crush his group of people who were weak and small in number. But this confrontation kept moving forward at a slow pace. Initially, the Quresh were so confident they will overpower and destroy this small and weak group that they were all united like a solid rock in their mission. There was not one opposing voice in the entire Quresh tribe regarding the efficacy of their mission. But look at the style of the Quran. A stage has arrived in this confrontation that listening to the words of the Quran one feels rapturous: عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ (78:1) – ABOUT WHAT do they [most often] ask one another? [Asad]. This indicates that the Quresh started doubting themselves about what is going to happen; that whether or not they would prevail. But the way the Quran presents this scenario is a mastery of literary excellence. My dear friends! Only a person who has high literary taste would appreciate this style: the Quresh started asking each other whether or not they are right? When an enemy reaches this stage, know that its defeat is certain. Also, differences and arguments started among themselves: هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ (78:3) – Concerning which they are in disagreement [Pickthall]. Do you notice what the Quran has alluded to here? Whenever in the ranks of the enemy murmur starts regarding the efficacy of their mission then know that doubts and disbelief have taken over their hearts about the success of their mission.

My dear friends! Let us project this scenario to ourselves. People ask now why was Pakistan demanded? But no one asked this question during the Pakistan movement; and there was no such thing as عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ (78:1) then. Leave aside others. I was there

at the time. I also have a friend in this audience who was there. We never talked about why we were doing this; that whether or not it is going to happen? There was no question about it. We had rock-solid belief that Pakistan *will* happen. We never doubted our mission, let alone differing about it.

Sabotaging the Pakistan's high mission

My dear friends! After Pakistan came into existence, the very first question that was raised was: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (78:1) – they ask why was Pakistan demanded? Different reasons were given – one being that it was due to the narrow-mindedness of the Hindus. That is, if they had extended the hand of friendship then we wouldn't have demanded Pakistan:

Such a thing as our very heart was rebuffed by the parishioners

of race and hatred;

Only after being completely helpless did we change our loyalty

that we had trusted!

If the Hindu was generous then: Who cares about Pakistan or Islam? – We would have made compromises with Hindus. Even now if he becomes a little magnanimous then we will go back on Pakistan. Some say that it was an economic issue that forced us to demand Pakistan because the opportunities for our landlords and capitalists were limited there. Others say that it was a conspiracy of the British who wanted to divide and leave. That is, first there was: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (78:1). And then there was: هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (78:3). And then we see our continuous slide into the abyss of ignominy – and we don't seem to care!

My dear friends! Our chain of slavery of the British and the Hindus that we were able to cut open was due to our intense desire and unyielding faith in the idea of Pakistan. Iqbal says: Chains of subjugation are rendered open if you could develop a taste for deep conviction in the efficacy of your mission. There was no such thing as عَمَّ يَتَسَاءلُونَ let alone مُخْتَلِفُونَ when we were fighting for Pakistan. But we have both these

things now: We are questioning its existence and we are sparring with each other. We doubt our future and we are scared. How and why did we arrive at this hopeless situation? There were no such questions even as late as June/July 1947. There were no doubts about Pakistan. But after gaining such a large nation-state why is this thought gaining ground as to whether or not Pakistan will remain. First عَمَّ يَتَسَاءلُونَ (questioning) happened and then don't ask about مُخْتَلِفُونَ : Some say it was created for secularism; others say the whole idea of two-nation theory was wrong. This is the form مُخْتَلِفُونَ (differences) have taken. Did you notice my friends! The matter we were discussing was of the time of the Prophet (PBUH) but look how its eternal truth is applicable now, and for all times to come.

The importance of eternal truths and *our* short-sightedness

My dear friends! These are eternal truths. In the life of a nation signs of defeat start with doubts about its goal; and then differences and arguments follow. The Quran has said about this: عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ (78:1). How beautiful are these two words! And then they have been used in interrogative style. What are they gossiping about? What is the thing that is causing them anxiety and doubt? What is causing them nightmare? The Quran says that they are asking about: عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ (78:2) – Concerning the Great News [Yusuf Ali]. But the traditional translators say that this is the news of the Hereafter. They transfer everything of importance to the Hereafter. Ask anyone. The immediate reply will be: They were asking the Prophet (PBUH) as to when the Day of Judgment or Al-Qiyamah (القيامة) will come. As far as the physical Universe is concerned everyone knows that it going to end one day. The Quran says that these planets and stars will collide and disintegrate one day. What has this got to do with our actions? Laws of nature will take care of that. That is, if they are to collide according to the laws of nature then what can we do anyway? Nothing at all. This is one type of Al-Qiyamah (القيامة). Another one is to come after death where we will face the results of our action done here, in this world. This is also called the Day of Distinction (يَوْمُ الفَصْل). What you sow is what you reap! What to say of this "يَوْمُ الفَصْل", my friends? When you have sown the seed then the Day of harvest is bound to come.

This is our belief. But there is another Al-Qiyamah (القيامة): The last phase in the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) has also been called Al-Qiyamah (القيامة) by the Quran: يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَٰلَمِينَ (83:6) – the Day when all mankind shall stand before the Sustainer of all the worlds [Asad]. On this Day humanity will stand up for universal sustenance. According to the rules of Arabic grammar "قيام" is derived from "قام" which means to stand up. And when the letter "ة" comes at its end then it means to stand up suddenly, as it happens in a revolution. Arabic language is unique. This is the revolution; this is the Al-Qiyamah (القيامة) which is described in the Quran again and again. Here, in this verse (78:1), it is said that they are asking you O Prophet (PBUH) about this huge event, about this Al-Qiyamah (القيامة) – Tell them it is the Day when humanity will suddenly rise up for universal sustenance. Otherwise, the Al-Qiyamah (القيامة) of the hereafter to come after death is mentioned in every religion. To make it interesting every religion is waiting for a Messiah to come and fix things up.

Waiting for a Messiah is against the teachings of the Quran

My dear friends! I will explain shortly how this belief in a coming Messiah will create Al-Qiyamah (القيامة) and Hell anyway! This belief started with Zoroastrianism. They believed that Mithra will come towards the end of the world. This concept of Christianity that Jesus was lifted alive to heaven (contrary to what the Jews say that he was crucified and died on the cross) and will come again to the Earth is borrowed from Zoroastrianism. Please read my book on religions of the world. Zoroastrians believe that Mithra has gone to the heaven and will come near the end of the world at the time of Al- Qiyamah (القيامة). Hindus, not to be left behind, believe that Klankini Avatar will come towards the end of time. Buddhists believe that Metteyya (Maitreya in Sanskrit) will come in the end. Jews are waiting their own Messiah. All of these Messiahs will come in the end. Everyone is waiting for an avatar to come. Not to be left alone, Muslims are also waiting for a Messiah. Everyone is still waiting. But the one they are waiting for came in the land of Hijaz – Muhammad (PBUH) the *last* prophet. He came for all those who were waiting; thus the belief in

anyone coming was ended, him being the last. In spite of that, we Muslims are still waiting for a Messiah. And so is everyone else.

The question is: if they come then what will they do? Everyone says that he will resurrect our religion. Please think about it my friends! Mithra will resurrect Zoroastrianism; Klankini avatar will resurrect Vedic dharma; Metteyya will fight for Buddhism; Jewish Messiah will fight for Judaism; Jesus will resurrect Christianity; and the Muslim's Mahdi will revive their religion of Islam. All of these Messiahs will fight to establish their religion – then would there be any doubt of Al-Qiyamah (القيامة)? They all will be fighting and destroying each other. But the Quran's – عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ (78:2) – is not about this Al-Qiyamah (القيامة); neither is it talking about the Al-Qiyamah (القيامة) after death nor about the Al-Qiyamah (القيامة) of the physical destruction of humans and this Universe. This verse (78:2) is not talking about any of these. I am not saying this of my own my dear friends! This is the Quran that is talking – in just two words: كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (78:4) – Verily, they shall soon (come to) know! [Yusuf Ali]. In the word "سَيَعْلَمُونَ" the letter "س" means "soon." And it is repeated with such a force and certainty: كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ; ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (78:4-5) – Verily, they shall soon (come to) know! Verily, verily they shall soon (come to) know![Yusuf Ali]. If you don't understand then note again that you will soon see this Al-Qiyamah (القيامة) with your own eyes; and then you will understand it! *Allahu Akbar!!* Did you understand my friends what was this عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ (78:1)? The Quresh's original belief in their mission was shaken. Their foundation was jolted. Differences occurred among them about their mission (to wipe out the Prophet (PBUH) and his companions). Then the Quran says that when your condition becomes like this then you do not have to wait long for the big news of your destruction; you do not have to wait long for Al-Qiyamah (القيامة).

Al-Qiyamah (القيامة) is the appearance of result

My dear friends! Nobody pays attention to what this word "سَيَعْلَمُونَ" and the letter "س" mean? As we mentioned: this means that the event in question is coming soon; that you will see it with your own eyes very soon. And the Quresh did see this

oncoming Al-Qiyamah (القيامة) very soon. This Al-Qiyamah (القيامة), this destruction staring right in front – if humans do not see then they cast themselves forever in hell; they forever remain in anxiety and trauma.

He is giving long sermon about accountability and balance of the hereafter's Qiyamah;

But how very sad! That the preacher does not see, here and now, the existing Qiyamah!

So much so that the preacher who was pronouncing fatwa of infidelity (Kufr) against others and sending them to hell:

The master preacher kept telling that Kafir will go to Hell;

However, the Kafir expressed it better than this, really well:

Look at this irony! The preacher himself is standing in Hell;

But pronouncing to the world that the place of others is Hell!

The preacher is standing in it himself but he is saying that Hell is the place of others. He does not see his own Hell in which he is standing. He and everyone else will soon know that we are all in hell: كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ; ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (78:4-5) – Verily, they shall soon (come to) know! Verily, verily they shall soon (come to) know! [Yusuf Ali]. We are all standing in our individual hell, my friends, and we are giving fatwas about others that they will go to Hell.

My dear friends! I am happy that we have been able to cover the proper context and the requisite background for this chapter. This will open the door for further understanding.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
12

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

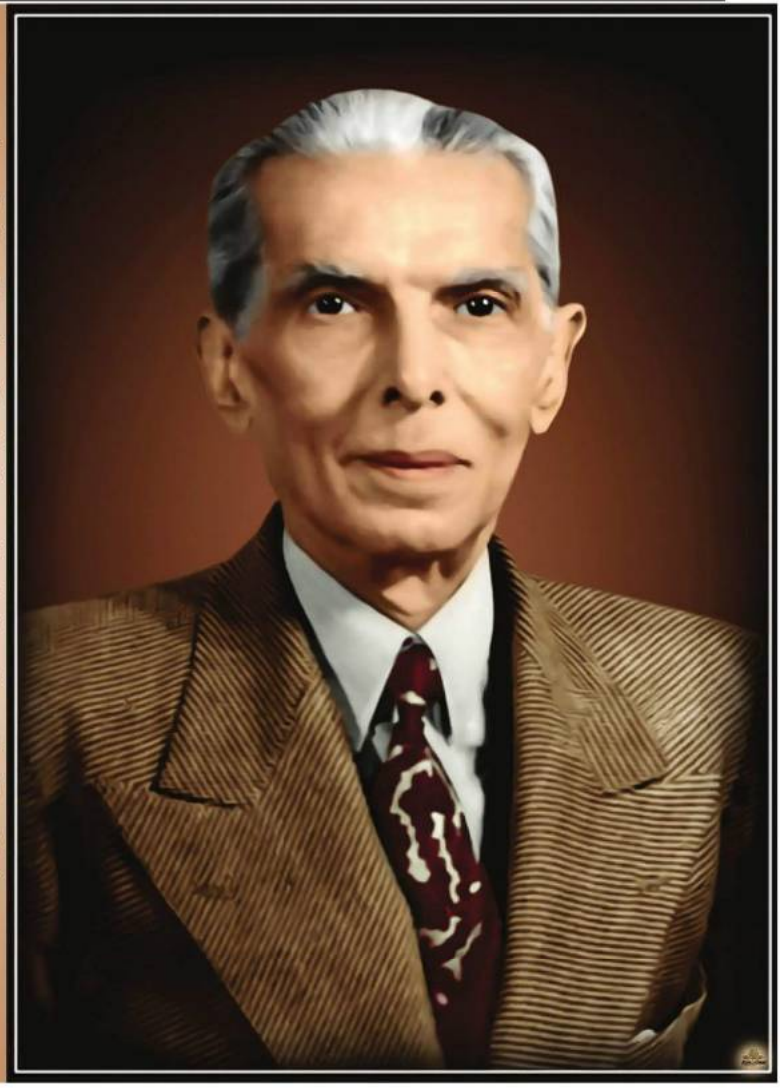

میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا اللہ گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔

(خطاب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل 21 اکتوبر 1939ء)